الف

عمیرہ احمد

قسط نمبر ۴

عمیرہ احمد

الف

حسن جہاں سے زندگی میں ایک غلطی سرزد ہوئی۔ لیکن وہ بھی معاف نہیں کی گئی، وہ بار بار خط لکھ کر اپنی غلطی کی معافی مانگتی ہے۔

ایک بچہ تواتر سے اللہ تعالیٰ کو خط لکھتا ہے اور اسے ایک درخت کے تنے میں رکھ دیتا ہے۔ وہ جواب کا
ایک دن ماں بتاتی ہے کہ اس کے خط کا جواب آ گیا ہے۔

ایک بوڑھا خطاط آیت کی خطاطی کر رہا ہے۔ یک دم اس پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اسے اپنے
روشنیوں کا ہالہ رقصاں نظر آتا ہے۔

قلب مومن انڈسٹری کا کامیاب ترین ڈائریکٹر ہے۔ اسے خود پر، اپنی صلاحیتوں پر پورا اعتماد ہے۔

مومنہ سلطان ایک باصلاحیت فنکارہ ہے لیکن اسے اب تک اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے کوئی موقع نہیں ملا ہے۔ انڈسٹری میں ہیروئنیں اس کے ٹیلنٹ سے خائف ہیں، وہ اسے آگے نہیں آنے دیتیں۔

مومنہ کا باپ سلطان میک اپ آرٹسٹ ہے۔ وہ اداکارہ حسن جہاں کا میک اپ مین رہ چکا ہے اور اس کا بہت مداح ہے۔ اب بیماری کی وجہ سے انڈسٹری سے آؤٹ ہے۔ مومنہ کی ماں ثریا بھی اپنے وقت کی اداکارہ ہے۔ انڈسٹری نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ مومنہ کے اکلوتے بھائی جہانگیر کے گردے جواب دے چکے ہیں، وہ ڈائیلاسس پر

PakiBooks Site

CCINATIONRE

گردے کے ٹرانسپلانٹ کے لیے ایک بڑی رقم کی ضرورت ہے۔ مومنہ فلموں میں کام نہیں کرنا چاہتی۔ اسے فلم انڈسٹری پسند نہیں ہے لیکن مجبوراً یہ کام کرنا پڑ رہا ہے۔

قلب مومن نئی فلم بنانے کا اعلان کرتا ہے تو داؤد مومنہ کی سفارش کرتا ہے۔ وہ آڈیشن کے لیے قلب مومن کے پاس جاتی ہے تو قلب مومن اس کو دوپٹا اتارنے کے لیے کہتا ہے۔ مومنہ انکار کر دیتی ہے تو وہ اسے اسٹوڈیو سے نکل جانے کے لیے کہتا ہے۔

مومنہ باہر نکل جاتی ہے تو اس کو یاد آتا ہے کہ وہ جہانگیر کی میڈیکل ٹیسٹوں کی فائل اسٹوڈیو میں بھول آئی ہے۔ وہ لوٹ کر جاتی ہے تو قلب مومن اس کے ساتھ بہت ہتک آمیز انداز میں پیش آتا ہے۔ جواباً مومنہ بھی کوئی لحاظ نہیں کرتی اور اسے کھری کھری سنا کر آئینہ دکھا دیتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ تمہارا کام چیپ اور تم اس سے زیادہ چیپ ہو، عورت کا جسم دکھا کر جو تم آرٹ کی خدمت کر رہے ہو، میں اس کا حصہ نہیں بننا چاہتی۔

٭ عبدالعلی اپنے باپ کو خط لکھتا ہے اور اس میں معذرت کے ساتھ اپنی تکلیف بھی بیان کرتا ہے۔ ان سے کہتا ہے کہ وہ اسے معاف کریں گے تو ہی اللہ اسے معاف کرے گا۔

قلب مومن کو اس کی ماں ایک خط دیتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ خط اللہ کی طرف سے آیا ہے۔ خط پڑھنے پر اسے علم ہوتا ہے کہ یہ خط اللہ نے نہیں اس کے دادا عبدالعلی نے لکھا ہے وہ اس سے ملنے آ رہے ہیں۔

حسن جہاں کو جب اس بات کا علم ہوتا ہے کہ اس کا شوہر بھی واپس آ رہا ہے تو وہ خوب بنتی سنورتی ہے اور بے تحاشا خوش ہوتی ہے۔ قلب مومن اپنی ماں کو اس طرح دیکھ کر مبہوت رہ جاتا ہے۔ اور ماں سے فرمائش کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ ایسی ہی رہے۔

مومنہ کو اس کی ماں سمجھاتی ہے کہ اسے عقل کرنی چاہیے تھی اور یوں انکار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ جہانگیر اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ وہ ایک دن ضرور سپر اسٹار بنے گی۔ جبکہ مومنہ اداکارہ نہیں بننا چاہتی۔ اسے خطاطی سے دلچسپی ہے۔

مومنہ اپنی انا کو مار کر اپنی دوست سے کہتی ہے کہ وہ ایک بار پھر داؤد سے بات کرلے۔ شاید قلب مومن اسے موقع دے دے۔ جہانگیر کی دن بدن بگڑتی حالت اسے مجبور کر دیتی ہے کہ وہ قلب مومن سے کام مانگے۔

جبکہ دوسری جانب مومن نیہا کو پرپوز کرتا ہے اور ایک بے حد قیمتی انگوٹھی اسے پہناتا ہے۔ قلب مومن کے گھر ہونے والی ایک اور پارٹی میں پوری انڈسٹری مدعو ہوتی ہے۔ لیکن اچانک ملازم کسی نئے مہمان کو اپنے ساتھ لے کر آتا ہے جسے دیکھ کر قلب مومن ساکت رہ جاتا ہے۔

قلب مومن اللہ کو خط لکھتا ہے۔

کچھ دن بعد اس سے اس کے دادا ملنے آتے ہیں لیکن باپ نہیں آتا۔ عبدالعلی سے حسن جہاں کو علم ہوتا ہے کہ اس کا شوہر عبدالعلی کے پاس بھی نہیں گیا۔ عبدالعلی قلب مومن کے لیے ایک پینٹنگ لے کر آتے ہیں جو ان کے ہاتھ کی بنی ہوتی ہے۔ کچھ دن بعد مومن ان سے نیہا کی ملاقات کرواتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ اس کی قریبی دوست ہے۔

مومنہ حالات سے مجبور قلب مومن کے پاس جاتی ہے لیکن وہ اسے بے عزت کر کے آفس سے نکال دیتا ہے۔ وہ انتہائی دکھی اور ٹوٹی حالت میں ماسٹر ابراہیم کے پاس جاتی ہے جہاں وہ شہید قرآن پاک کی مرمت کا کام کرتے ہیں۔ وہ اسے تسلی دیتے ہیں۔ وہیں اس کی ملاقات ایک لڑکی سے ہوتی ہے۔

مومنہ کو اس کی دوست کا فون آتا ہے وہ اسے آڈیشن کے لیے لاہور بھیجتی ہے جہاں اس کا آڈیشن کامیاب ہو جاتا ہے اور اسے بالی وڈ کی فلم کے لیے سائن کر لیا جاتا ہے۔

قلب مومن اور نیہا کا جھگڑا ہو جاتا ہے جس کی وجہ ضوفی ہے۔ مومنہ کراچی واپس آتی ہے تو اسے داؤد کا رویہ عجیب لگتا ہے وہ گھر کے بجائے اسے مردہ خانہ لے آتا ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

میری پیاری بیٹی حسن جہاں!
السلام علیکم
تمہارا حال پوچھنا چاہتا ہوں...... پوچھنے کی ہمت نہیں کر پا رہا۔ تمہارا حال تو جانتا ہوں میں...... اور میں ہی توجہ بنا ہوں تمہیں اس حال میں لانے کی...... تمہیں کیا لکھوں۔ میری بیٹی کیا لکھوں؟
بہت ساری باتیں ہیں جو تم سے کہنا چاہتا ہوں لیکن لفظ...... لفظ اس کاغذ پر وہ لکھنے سے قاصر ہیں جو میرے دل میں ہے۔ لیکن تمہارا دوبارہ سامنا کرنے سے تمہارے نام یہ خط لکھنا آسان ہے میرے لیے۔
تم سے کیا کہوں......؟ کہ میں شرمندہ ہوں یا یہ اعتراف کروں تم سے کہ میں گناہ گار ہوں کہ حسن جہاں تمہارا وہ گھاؤ بھر جائے جو میرے ہاتھوں لگا اور تم مجھے معاف کر سکو۔
میں نے اپنی ساری زندگی کینوس اور کاغذ پر صرف اللہ کی بڑائی اور صناعی بیان کرتے گزاری ہے۔ روشنائی اور رنگوں سے خطاطی کرتے عمر بسر کی ہے، مگر یہ سمجھ نہیں پایا کہ اللہ کی بڑائی بیان کرتے کرتے غرور کا وہ کون سا لمحہ تھا جس میں میں خود کو بھی "بڑا" مان بیٹھا تھا...... نیک، متقی، پرہیزگار۔ گناہ نہ کر سکنے والا...... یاد نہیں حسن جہاں! میں مومن سے کافر کس وقت ہوا تھا...... لیکن کبھی نہ کبھی کچھ تو ایسا کر بیٹھا تھا میں کہ ٹھوکر کھائی تو اللہ نے سنبھالا نہیں، گرنے دیا...... اور میں گرتا ہی چلا گیا۔
اور اب جب یہ خط لکھنے بیٹھا ہوں تو یہ کاغذ آئینہ بن کر مجھے میرا وہ عکس دکھا رہے ہیں جن سے میں نظریں نہیں ملا سکتا۔
اس عمر میں اکلوتی جوان اولاد کو کھو دینے کے بعد میری زندگی کا وہ محور گم ہو گیا ہے جس کے گرد میری زندگی گھومتی تھی۔ اب کچھ بھی یاد نہیں رہتا مجھے۔ نہ کھانا نہ پینا...... نہ سونا جاگنا...... نہ ہی دنیا کی کوئی اور چیز...... طٰہٰ سب کچھ لے گیا ہے میرا...... بس میرا وجود چھوڑ گیا ہے اپنے اس پچھتاوے کے ساتھ جو ہر وقت میرا اگلا گھونٹتا رہتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، اب اس پچھتاوے کا کروں کیا اور اس وجود کا مصرف کیا رہ گیا ہے۔
وہ خطاطی جو کئی نسلوں سے خون کی طرح ہماری رگوں میں بہتی آئی تھی طٰہٰ کے جانے کے بعد سوکھنے لگی ہے۔ اب میری اگلی نسلوں میں کوئی اللہ کی کبریائی اور بڑائی بیان کرنے والا نہیں آئے گا۔ یہ میری سزا ہے...... میرے غرور کی...... میں اس کی شکایت کسی سے نہیں کر سکتا۔
طٰہٰ مٹی ہو گیا...... میں مٹی بھی نہیں ہو سکتا...... اس دنیا سے جانے کی باری میری تھی۔ مہلت اس کو نہیں ملی۔ اس عمر میں جو غم میرے حصے میں آیا ہے، وہ جھیلا نہیں جا رہا۔ یہ جو گھر ہے، جس میں میں رہتا ہوں، یہاں کی ہر شے، ہر دیوار کے ساتھ اس کی یادیں لپٹی ہیں۔ میں ہر روز صبح اس کی یادوں کو درختوں کی بڑھی ہوئی شاخوں کی طرح کاٹ کر باہر پھینک آتا ہوں۔ وہ رات تک پھر سے اُگ آتی ہیں، پرانی یادوں کی رہ جانے والی جڑوں میں سے...... میں یہ فصل کاٹتے کاٹتے تھکنے لگا ہوں۔ گھر طٰہٰ سے خالی ہو گیا اس کی یادوں سے خالی ہونے کو تیار نہیں۔
وہ تمہارے ساتھ چلا گیا تھا تو اس گھر میں اس کی یادیں اس طرح نہیں اُگتی تھیں۔ میری نفرت اور غصہ ہر اُگنے والی یاد کو کھا جاتے تھے۔ اب ایسا نہیں ہوتا۔ اب میرے اندر کچھ بھی نہیں رہا۔ فخر، غرور، آن، غصہ سب ختم ہو گیا...... اگر کچھ بچا ہے تو روشنی کی وہ کرن جو قلب مومن کے نام سے تمہارے گھر کو روشن کیے ہوئے ہے۔ میں ہر وقت اس کے بارے میں سوچتا ہوں جب اپنے اندر باہر ہر طرف اندھیرا ہو جاتا ہے تو اُس کے چہرے کی روشنی مجھے راستہ دکھانے لگتی ہے۔ کیا اسے اپنا یہ بوڑھا دادا یاد آتا ہے......؟ مگر میں اُسے کیوں یاد آؤں گا؟ میں نے اُس کو دیا ہی کیا ہے؟ اسے پہلی بار دیکھا تو مجھے لگا طٰہٰ کا بچپن لوٹ آیا وہ بچپن میں قلب مومن جیسا ہی تھا۔ ویسا ہی معصوم چہرہ ویسی ہی میٹھی آواز، ویسے ہی سوال اور شرارتیں...... پر قلب مومن تو شرارتیں نہیں کرتا۔ وہ تو

بس طے کیا کرتا تھا، قلبِ مومن تو بس سوال کرتا ہے اور ان سوالوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں..... اس کا مجرم ہوں میں..... میں نے اُس سے شرارتیں چھین کر یہ سوال تھما دیے۔ میں نے بڑا ظلم کیا۔

میری بیٹی حسنِ جہاں..... تم مجھے معاف کردو۔ دل سے معاف کردو۔ قلبِ مومن کو میرا بہت پیار دینا۔ اُس سے کہنا وہ اللہ کو ایک خط اپنے دادا کے لیے بھی لکھے۔ اللہ سے کہے..... اُس کے دادا کا ہنر اُسے واپس کردے۔ قلبِ مومن کا ہر خط اللہ کو پہنچ جاتا ہے، وہ تمہارا بیٹا ہے نا اس لیے۔

والسلام

قلبِ مومن کا دادا

☆☆☆

قلبِ مومن نے اسٹریچر پر لیٹی حسنِ جہاں کو دیکھا جسے پیرامیڈکس گھر سے باہر کھڑی ایمبولینس کی طرف لے جا رہے تھے اور پھر اُس نے اپنے دادا کو دیکھا جو بہتے آنسوؤں کے ساتھ اُس اسٹریچر کے پیچھے آ رہا تھا۔ قلبِ مومن اور اُن کی نظریں ملی تھیں اور قلبِ مومن کے چہرے کا خوف جیسے عبدالعلی کی آنکھوں میں جھلکا تھا۔ مومن سائیکل سے گرنے کے بعد اپنی چوٹوں کو بھول گیا تھا اور اپنی اُس سائیکل کو بھی جو رستے میں گری پڑی تھی۔ وہ بس ایمبولینس کی طرف بھاگا تھا اور دادا نے اُسے روک لیا تھا۔

''ممی کو کیا ہوا؟ میری ممی کو کیا ہوا؟'' عجیب خوف کے عالم میں اُس نے عبدالعلی سے پوچھا تھا۔

''دعا کرو کچھ نہ ہو۔'' عبدالعلی نے اُسے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا تھا۔

ایمبولینس اب دور جا رہی تھی اور قلبِ مومن کو عبدالعلی کی ٹانگوں سے لپٹ کر جیسے عجیب سکون کا احساس ہوا تھا وہ کسی چڑیا کے بچے کی طرح کانپ رہا تھا۔ عبدالعلی نے اُسے گود میں اُٹھا لیا۔ وہاں کھڑے آس پاس کے گھروں میں رہنے والے لوگ اب وہاں سے آہستہ آہستہ جانے لگے تھے۔ دادا کی گود میں چڑھے قلبِ مومن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ان لوگوں کی آنکھوں میں اس کے لیے ترس کیوں تھا..... وہ اس عمر میں بھی اُس احساس کو پہچان سکتا تھا۔

''ممی کے پاس جانا ہے۔'' اُسے ایک دم ماں کی یاد دوبارہ آئی تھی اور تب ہی اس نے عبدالعلی کی آنکھوں سے مسلسل بہتے ہوئے آنسو بھی دیکھے تھے۔ وہ شاید اُس کی ممی کے لیے رو رہے تھے۔ قلبِ مومن نے خود ہی سوچ لیا تھا، اُن آنسوؤں نے قلبِ مومن کے دل کو جیسے کچھ اور نرم کیا تھا عبدالعلی کے لیے۔

آئی سی یو میں حسنِ جہاں بے ہوش پڑی ہوئی تھی اور عبدالعلی کے ساتھ قلبِ مومن بھی اُسے شیشے سے دیکھ کر بُری طرح بے چین ہوا تھا۔

''ممی کو کیا ہوا ہے دادا؟'' اس نے عبدالعلی کے ہاتھ کو بے تابی سے ہلایا تھا۔ اپنی آنکھوں کو رگڑتے ہوئے عبدالعلی نے اُس سے کہا۔

''وہ بیمار ہوگئی ہیں۔'' اُسے بتاتے ہوئے ان کی آواز بھر آئی۔

قلبِ مومن نے اس بار ان آنسوؤں پر غور کیا۔ ''آپ کیوں رو رہے ہیں؟'' اس بار وہ جیسے پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔

''مجھ سے ایک گناہ ہوگیا ہے مومن۔'' عبدالعلی کا جیسے حوصلہ جواب دے گیا۔

مومن کو یک دم یاد آیا، اُس کی ماں نے بھی تو کسی گناہ کی بات کی تھی جس کو اُس کے باپ نے معاف نہیں کیا تھا اور اب دادا بھی کسی گناہ کی بات کر رہے تھے۔

''ممی نے کہا تھا، اُن سے بھی کوئی گناہ ہوا تھا۔'' اس نے بے اختیار عبدالعلی سے کہا۔

''نہیں تمہاری ممی نے کوئی گناہ نہیں کیا مومن..... یہ میرے گناہ کی سزا ہے۔'' وہ بلک بلک کر رونے لگے تھے۔

قلبِ مومن کو اُس لمحے عبدالعلی پر بہت زیادہ ترس آیا۔ اس کا دل چاہا، وہ انہیں اپنے ساتھ لگا کر تھپکے جیسے وہ اُسے تھپکتے تھے۔

''اللہ تعالیٰ کیا ہم سب کو سزا دیتے ہیں؟ مجھے اُن سے بہت ڈر لگتا ہے دادا۔'' عبدالعلی کا ہاتھ دوبارہ تھامتے ہوئے قلبِ مومن نے جیسے اپنا خوف اُن کی جھولی میں ڈالا۔

''اللہ سزا نہیں دیتا..... ہم سب دیتے ہیں۔'' انہوں نے جیسے اس ننھے بچے کے دل سے اُس خوف کو مٹانے کی کوشش کی۔

''کیا اللہ تعالیٰ ہم سے سزا دینے کو کہتے ہیں؟''

''مومن! مجھ سے وہ سوال مت پوچھو جس کا جواب میرے پاس نہیں۔'' اس نے عبدالعلی کو ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا تھا۔ آئی سی یو کے شیشے سے اُس نے بستر پر آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی حسنِ جہاں کو دیکھا۔ قلبِ مومن کو اُس وقت احساس ہوا اُسے صرف حسنِ جہاں کی ضرورت تھی بابا کی نہیں وہ اُن کے بغیر رہنا سیکھ چکا تھا..... وہ حسنِ جہاں کے بغیر رہنا سیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

اگلے دو دن وہ دادا کے ساتھ ہاسپٹل جاتا رہا اور پھر اُس نے بالآخر حسنِ جہاں کو آنکھیں کھولتے دیکھ لیا تھا۔ لیکن یہ وہ آنکھیں نہیں تھیں جنہیں وہ ہمیشہ سے دیکھتا آیا تھا۔ یہ آنکھیں خالی تھیں، اُن میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اُس آٹھ سال کے بچے نے وہ تبدیلی محسوس کی تھی اور بڑی شدت سے کی تھی۔ کچھ ہوا تھا اُس کی ماں کو مگر کیا ہوا تھا۔ یہ وہ جان نہیں پا رہا تھا۔

''ممی! آپ ٹھیک ہو گئیں میں نے اتنی دعائیں کی تھیں۔'' اُس نے حسنِ جہاں سے لپٹ کر جیسے اُس میں وہی گرمی، وہی تمازت ڈھونڈنے کی کوشش کی جو ہمیشہ سے وہ اُس کی آغوش میں محسوس کرتا تھا۔ حسنِ جہاں نے اُسے لپٹا لیا تھا۔ قلبِ مومن نے اُسے کہتے سنا۔

''میں نے بھی بڑی دعائیں کی تھیں۔ میری تو کوئی دعا قبول نہیں ہوئی.....''

قلبِ مومن نے حسنِ جہاں کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی مگر عبدالعلی کی آواز نے اُسے اپنی طرف متوجہ کر لیا، اُس نے انہیں ہاتھ جوڑتے۔ حسنِ جہاں سے کہتے سنا۔

''مجھے معاف کر دو بیٹی، مجھے معاف کر دو۔'' حسن جہاں بڑبڑائی تھی۔

''آپ کو معاف کر دوں گی..... اپنے آپ کو کیسے کروں گی۔'' وہ کیا پہیلی تھی جو عبدالعلی اور حسنِ جہاں کی گفتگو میں پنہاں تھی۔ وہ کیا گناہ تھا جو انہیں سزا دے کر گیا تھا اور وہ کیا شے تھی جس سے وہ محروم ہوئے تھے۔ قلبِ مومن سمجھ نہیں پایا..... سمجھ میں آئی تھی تو صرف ایک بات..... وہ دونوں اب اُس کے باپ کی بات نہیں کرتے تھے اور اُس کو پہلے کی طرح ڈھونڈ بھی نہیں رہے تھے..... مگر قلبِ مومن اب حسنِ جہاں سے کوئی ایسی بات نہیں پوچھنا چاہتا تھا جو اُس کی ماں کو رلاتی اور پتا نہیں کیوں اُسے لگتا تھا، وہ یہ سوال کرے گا تو اُس کی ماں روئے گی۔

اللہ کو ایک اور خط لکھنا ضروری ہو گیا تھا کیونکہ قلبِ مومن کو کوئی جواب اپنی دنیا اور اپنے رشتوں سے نہیں مل رہا تھا۔

''جب غلطیاں ہو جاتی ہیں تو کیا وہ کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتیں اور جب گناہ ہو جائیں تو کیا ہمیشہ اُن کی سزا ملتی ہے..... کیا اللہ معاف نہیں کر سکتا؟''

قلبِ مومن کو اب اللہ تعالیٰ سے یہی سوال کرنے تھے کیونکہ وہ اپنے گھر میں دو لوگوں کو تکلیف میں دیکھ رہا تھا اور وہ اُس تکلیف کی جڑ کو کھوجنا چاہتا تھا۔

جنگل میں تنے پر دھرا اس کا لیٹر باکس غائب تھا۔ قلبِ مومن کو چند لمحے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا۔

وہ شاید کسی تالاب تک ... آ گیا تھا اور جھول ...... اگر وہ اتنے دنوں سے یہاں آیا تھا اور جنگل میں ... بھی راستہ نہیں بھولا تھا۔ صدمے کی کیفیت میں وہ اُس درخت کے گرد ... رہے تھے ... بہت سارے دوسرے گزرے ہوئے دنوں کی طرح آج بھی ... پاس اُس کو ... اُس کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ملا تھا۔ بے حد مایوسی کے عالم میں وہ اُس دن واپس گھر آیا تھا ... میں جانے کی وہ چاہ ہو گیا تھا۔ وہ لیکن پاس اُس ایک جگہ میں پڑا تھا۔ ... باہر۔ قلبِ مومن بے چینی کی کیفیت میں اُس لیے پاس اُس کو لیے بیٹھا رہا ... تھا کیا اُس نے ... وہاں اُس جنگل میں اُس درخت پر لکھا تھا اور وہ اس کے اندر کھدا ہوا تھا...... کیا اللہ یہ بھی جانتا ہے ......

اُسے مزید سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ حسن جہاں کی آواز تھی جس نے اُسے چونکا دیا تھا۔

"مومن! ہم پاکستان جا رہے ہیں۔" وہ بے اختیار پلٹا تھا۔ حسن جہاں کمرے کے دروازے میں کھڑی تھی۔

"کیوں؟" وہ حیران ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا اُس کی ماں کا تعلق پاکستان سے تھا مگر اُس کا کوئی نہیں تھا۔

"رہنے کے لیے...... اب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ پاکستان میں رہیں گے۔"

مدھم آواز میں جو اُس نے حسن جہاں کی زبان سے سنا اُس نے مومن کو ہلا دیا تھا...... اُس کی ماں وہاں سے کیوں کسی اور جگہ لے جانا چاہتی تھی، یہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ مزید سوال کرنا چاہتا تھا مگر وہ چلی گئی تھی۔ وہ جب سے ہاسپٹل سے آئی تھی، اُس سے بہت کم بات کرتی تھی۔ اگر کسی سے بات کرتی بھی تھی تو وہ ساری باتیں سرگوشیوں اور آنسوؤں کی زبان میں ہوتیں اور قلبِ مومن اُن دونوں چیزوں سے بے بس ہو گیا تھا۔ اس پہیلی سے بھی اُس پہیلی سے بھی۔

☆☆☆

ریلوے اسٹیشن پر انہیں دادا چھوڑنے آئے تھے۔ وہ اُس شہر سے دوسرے شہر ریل سے جاتے پھر وہاں سے ہوائی جہاز پر پاکستان چلے جاتے۔ مومن کو یہ سب یاد تھا کیونکہ یہ اسے دادا نے بتایا تھا۔

"آپ ہمارے گھر میں رہیں گے؟" اُس نے دادا سے پوچھا تھا۔

"نہیں مومن! میں واپس چلا جاؤں گا۔" عبدالعلی نے جواباً اُسے بتایا۔

"واپس کہاں؟" مومن نے کریدا۔

"جہاں سے میں آیا ہوں۔" اُس نے دادا کو مدھم آواز میں کہتے سنا۔ وہ اُن کا سامان گھر سے باہر رکھوا کر گاڑی تک لا رہے تھے۔ مومن نے حسن جہاں کو دیکھا۔ وہ اُس گھر کو نہیں دیکھ رہی تھی، بس اُس ٹیکسی کی طرف جا رہی تھی جو اُن کے گھر کے باہر کھڑی تھی۔ قلبِ مومن نے اُس گھر کو چھوڑتے ہوئے عجیب اداسی محسوس کی۔ اُسے رونا بھی آیا مگر دادا نے اُسے اپنے سینے میں چھپا لیا تھا۔

اور اب ریلوے اسٹیشن پر دادا کو خدا حافظ کہتے ہوئے قلبِ مومن کو پھر رونا آیا تھا۔ دادا اب اُسے اچھے لگنے لگے تھے۔

"دادا! آپ ہمارے ساتھ چلیں۔" اُس نے عبدالعلی کا ہاتھ تھامے اُن سے کہا۔

"ابھی نہیں جا سکتا...... پھر کبھی آؤں گا۔" اُس نے دادا کو کہتے سنا۔

"آپ بابا کو ڈھونڈ لینا اور اُن کو ساتھ لے کر آنا۔" اُن کے گلے لگتے ہوئے قلبِ مومن نے اُن کے کان میں سرگوشی کی۔ اتنے ہفتوں کے بعد آج پہلی بار اُس نے باپ کا ذکر کیا تھا مگر وہ سمجھدار تھا۔ اُس نے ماں کو اس کی خبر نہیں ہونے دی تھی۔ عبدالعلی نے اُس سے کچھ نہیں کہا تھا بس اُس کا سر اور ماتھا چوما تھا۔ قلبِ مومن نے اپنے ماتھے پر اُن کے آنسوؤں کی نمی محسوس کی تو اُسے ہاتھ سے چھوا۔ ٹرین چلنے والی تھی۔ حسن جہاں کے سر پہ ہاتھ

رکھتے ہوئے اس کے دادا نے انہیں رخصت کیا تھا۔ قلبِ مومن نے ان دونوں کے درمیان کسی اور جملے کا تبادلہ نہیں سنا تھا۔ ماں کی انگلی پکڑے ٹرین کے دروازے تک پہنچتے قلبِ مومن نے پلٹ کر دیکھا۔ اُس کے دادا وہیں کھڑے رو رہے تھے جہاں وہ اُن سے الگ ہوئے تھے۔ اُس نے گردن موڑ کر حسنِ جہاں کو دیکھا، وہ بھی بے آواز رو رہی تھی۔ قلبِ مومن کا دل دُکھا۔ اُسے یقین تھا وہ دونوں بابا کے لیے رو رہے تھے اگر بابا مل جاتے تو سب کچھ ٹھیک ہو جاتا۔ مگر وہ اُنہیں ڈھونڈ نہیں سکے تھے۔ اُس نے مایوسی سے سوچا۔

''بابا مل جاتے تو کوئی بھی ایسے نہ روتا۔'' اُسے پاکستان میں ایک بار پھر سے کوئی ایسی جگہ ڈھونڈنا تھی جہاں وہ لیٹر باکس رکھتا اور پھر اُس میں وہ خط ڈالتا جس میں اللہ سے کیے گئے سوال اور فرمائشیں ہوتیں۔

☆☆☆

''یہ ہمارا گھر ہے؟''

قلبِ مومن نے بے یقینی کے عالم میں اُس وسیع و عریض شان دار بنگلے کے دروازے کو دیکھتے ہوئے ماں سے پوچھا تھا جس کے باہر وہ ٹیکسی سے اُتر کر کھڑے تھے اپنے سامان کے ساتھ۔ حسنِ جہاں نے اُسے دیکھے بغیر سر ہلایا تھا۔ وہ جیسے کسی سوچ میں گم تھی، کوئی اُدھیڑ بن کرتے ہوئے۔ قلبِ مومن اپنی خوشی پر قابو پانے سے قاصر تھا۔ اتنا بڑا گھر..... وہ تو ولا تھا۔ ترکی سے پاکستان آجانے کا غم یک دم غائب ہو گیا تھا۔ وہ سر اُٹھا کر گیٹ سے پرے نظر آنے والی اُس دو منزلہ شان دار عمارت کو دیکھتا رہا۔ جس کا گیٹ کسی مرد نے کھولا تھا۔

''کون؟'' وہ کوئی ملازم تھا مگر اپنا جملہ پورا نہیں کر سکا تھا۔ حسنِ جہاں کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اُس نے بے اختیار گیٹ کھول دیا تھا۔ حسنِ جہاں سامان چھوڑ کر قلبِ مومن کا ہاتھ پکڑے کھلے دروازے سے اندر آئی تھی۔

''ممی ہم رچ (امیر) ہو گئے ہیں؟'' قلبِ مومن نے بے پناہ خوشی کے عالم میں گھر کے اندر کھڑی گاڑیوں اور لان کو دیکھتے ہوئے ماں کے ساتھ چلتے ہوئے اُس سے پوچھا۔ وہ جواب دیے بغیر اُس کی اُنگلی پکڑے چپ چاپ چلتی رہی۔

''ہم گاڑی میں بیٹھا کریں گے اب؟'' قلبِ مومن کو پروا نہیں تھی کہ اُس کے پچھلے سوال کا جواب آیا تھا یا نہیں۔ وہ اُن چمکتی دمکتی گاڑیوں سے مرعوب ہو رہا تھا جن کو اُس نے ٹی وی پر یا ترکی کی سڑکوں پر دیکھا تھا۔

حسنِ جہاں اب اُس کا ہاتھ پکڑے اُسے گھر کے اندر لے آئی تھی اور قلبِ مومن نے پہلی بار اُس گھر کی دیواروں پر جگہ جگہ حسنِ جہاں کی تصویریں لگی دیکھی تھیں۔ بے حد بھڑکیلے کپڑوں میں میک اپ سے لتھڑے ہوئے چہرے کے ساتھ عجیب عجیب پوز اور پوسچرز میں..... ایک لمحہ کے لیے اُسے لگا وہ اُس کی ممی نہیں۔ اُس کی ممی تو کبھی بھی ایسے کپڑے نہیں پہنتی تھیں اور ڈانس تو کبھی نہیں کر سکتیں اس طرح۔

''ممی! یہ آپ کی تصویریں ہیں؟'' وہ حسنِ جہاں سے جیسے تصدیق چاہتا تھا۔ حسنِ جہاں نے اُس کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ اُن بہت سارے لوگوں کی طرف متوجہ تھی جو لاؤنج میں بیٹھے تھے اور اُنہیں دیکھ کر جیسے وہ سب ہکا بکا ہو گئے تھے۔

''اماں..... میں آ گئی۔'' قلبِ مومن نے حسنِ جہاں کو اُن پانچ چھ لوگوں میں شامل ایک عورت کو مخاطب کرتے دیکھا۔ مومن نے اُلجھی نظروں سے ماں کو دیکھا۔ وہ جیسے ماں کا وہاں موجود لوگوں سے رشتہ سمجھنا چاہتا تھا۔

ایک تخت نما کاؤچ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے وہ ادھیڑ عمر عورت بیٹھی ہوئی تھی جسے حسنِ جہاں نے ماں کہہ کر پکارا تھا اور جس کے سامنے وہ اب قلبِ مومن کے ساتھ مجرمانہ انداز میں سر جھکائے کھڑی تھی۔

''آنا ہی تھا تو نے حسنِ جہاں..... آنا ہی تھا..... تو مجھے اعلان کر کے کیا بتا رہی ہے۔'' اُس عورت نے آلتی پالتی مارے بیٹھے بیٹھے اپنا گاؤ تکیہ سیدھا کیا۔ اُس کی کاٹ دار نظریں قلبِ مومن پر ایک لمحہ کے لیے لگی تھیں پھر

PakiBooks.Site

دوبارہ حسنِ جہاں پر چلی گئی تھیں۔

''اب آ گئی ہے تو بیٹھ جا...... پانی پلا اسے۔'' اُسی عورت نے حسنِ جہاں سے کچھ پیچھے کی ملازم سے بات کی تھی۔ حسنِ جہاں میکانیکی انداز میں ایک صوفہ پر بیٹھ گئی۔ قلبِ مومن کو اُس نے اُسی صوفے پر اپنے ساتھ بٹھایا تھا۔ قلبِ مومن نے باری باری اُن سب لوگوں کو دیکھنا شروع کیا جو وہاں کھڑے تھے۔ اُن سب کی نگاہوں اور آنکھوں میں اُس نے اپنی ماں کے لیے ایک ہی تاثر دیکھا تھا۔ نفرت کا۔ قلبِ مومن کا دل یک دم گھبرا گیا تھا۔ وہ شاندار گھر اُسے اچھا نہیں لگ رہا تھا نہ ہی وہاں موجود لوگ۔ اُن میں سے کسی کی توجہ قلبِ مومن پر نہیں تھی۔

''ممتاز نے حسنِ جہاں بنایا اور تو چلی تھی حُسنہ بننے۔'' قلبِ مومن نے اُسی عورت کو تیز انداز میں عجیب ہنسی کے ساتھ اپنی ماں سے کہتے سُنا۔ اُس نے ماں کا چہرہ دیکھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اُس کے چہرے پر کچھ بھی نہیں تھا۔

''خود غرضی دیکھیں اماں اس کی...... ہمارا نہیں سوچا اس نے۔'' اس بار قلبِ مومن نے ایک مرد کو بلند آواز میں کہتے سنا تھا۔

''ہم مرتے یا جیتے، اس نے پروا نہیں کی۔'' وہ وہاں کھڑی ایک اور لڑکی تھی جس کی شکل اس کی ماں سے ملتی تھی۔ قلبِ مومن نے اُس کی بات سنتے ہوئے غور کیا۔

''پروا کیوں کرتی یہ...... ؟ یہ تو پیار کر رہی تھی...... پیار بڑا ہوتا ہے۔ ماں باپ، بہن بھائی سے بھی بڑا...... وہ تو مسیحا بن کر آیا تھا اس کے لیے...... شیطان تو ہم تھے...... کیوں حسنِ جہاں۔''

قلبِ مومن نے ایک بار پھر اُسی ادھیڑ عمر کی عورت کو کہتے سنا۔ وہ اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر کچھ رکھ کر دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی سے اُسے مسلتے ہوئے منہ میں ڈال رہی تھی۔ اُس کی موٹی موٹی آنکھیں سیاہ کاجل کے ساتھ اس وقت بے حد خوف ناک لگی تھیں مومن کو۔ اور اُس کے ہونٹوں اور دانتوں دونوں پر عجیب سا لال رنگ لگا ہوا تھا۔ قلبِ مومن اُسے بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ اُس کی نانی تھی۔ حسنِ جہاں نے ایک بار اُسے بتایا تھا کہ چاند کی بڑھیا کی طرح اُس کی بھی ایک نانی تھی۔ جو دور دیس میں رہتی تھی مگر قلبِ مومن نے جو تصور اپنی اُس نانی کا بنایا تھا وہ ممتاز جہاں جیسا نہیں تھا۔

''ایسے تو کوئی سوتیلے رشتوں کے ساتھ نہیں کرتا جس طرح اس نے سگے رشتوں کے ساتھ کیا۔ کام دوبارہ شروع کیا تھا میں نے اور یہ اُس وقت بھاگ گئی۔ میرا کاروبار ڈبو گئی۔''

قلبِ مومن نے اُسی مرد کو دوبارہ بلند آواز میں کہتے سُنا جس نے پہلے اُس کی ماں کو ملامت کی تھی۔ عجیب بے چینی کے ساتھ اُس نے حسنِ جہاں کو دیکھا تھا۔ وہ ویسے ہی بیٹھی تھی خاموش، سر جھکائے، خشک آنکھوں کے ساتھ۔ مومن بے قرار ہوا۔ اُس کی ماں کو بولنا چاہیے تھا، کچھ کہنا چاہیے تھا۔ اس طرح کیوں اُسے بُرا بھلا کہہ رہے تھے وہ سب لوگ۔ وہ ماں کو جھنجھوڑنا چاہتا تھا۔

''مجھے فلم میں کام دلوانا تھا پر نہیں۔ باجی کو کیا؟ بس خود نمبر ون رہتی...... اپنا سکہ چلتا رہتا...... بہن جائے بھاڑ میں۔'' اب وہ لڑکی تُنک کر کہہ رہی تھی۔ قلبِ مومن نے حسنِ جہاں کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ ماں کو اُن سب کی باتوں سے بچانے کے لیے فی الحال صرف یہی کر سکتا تھا۔

''کیسی کیسی تمنائیں کی تھیں میں نے...... ماں کی سالوں کی محنت کو پیار کی بھٹی میں جھونک...... نمبر ایک ہیروئن بنا کر راج کروا رہی تھی ممتاز، کروڑوں مردوں کے دلوں اور دماغوں پر...... یہاں اس کو چاہیے تھا ایک مرد کے نام کا بیٹا...... اور یہ بچہ...... اب ممتاز کیا کرے تیرا...... اچار ڈالے...... اماں میں آ گئی۔'' ممتاز اب بالا [illegible] کا ذینہ سے اُتر آئی تھی اور اپنی پاٹ دار آواز میں حسنِ جہاں کو لعنت ملامت کرتے ہوئے اُس نے اس کی نقل اُتاری اور پھر لاؤنج سے نکل گئی۔ اُس کے پیچھے باری باری وہ سارے لوگ بھی وہاں سے چلے گئے تھے۔ جو جسے

جہاں کو ممتاز کی طرح وقفے وقفے سے برا بھلا کہہ رہے تھے۔
عجب خاموشی تھی جوان سب کے جانے کے بعد وہاں در آئی تھی اور اسی خاموشی میں قلبِ مومن نے پہلی بار وہاں اُس شخص کو نمودار ہوتے دیکھا جو اُن کے ترکی والے گھر آیا تھا تو اُن کی زندگی تباہ کر کے چلا گیا تھا۔ قلبِ مومن کی آنکھوں میں اُس کا چہرہ نقش تھا۔ وہ اتنے عرصہ بعد بھی اُسے پہلی نظر میں پہچان گیا تھا۔ کسی تعارف کے بغیر۔
وہ شخص بلی کی طرح دبے قدموں اندر آیا تھا اور اندر آتے ہوئے اُس کی نظریں صرف حسنِ جہاں پر تھیں۔ وہ سیدھا اُس کے سامنے آیا تھا۔ پھر مومن نے اُسے اپنے سامنے کھڑے ہوتے دیکھا۔ وہ حسنِ جہاں کی ٹھوڑی کو اپنے ہاتھ سے اوپر اٹھا رہا تھا۔ حسنِ جہاں اور اُس کی نظریں ملی تھیں۔ مومن کا دل چاہا وہ اپنی ماں کی ٹھوڑی کے نیچے سے اُس کے ہاتھ کو جھٹکے۔ مگر اُس کی ماں اُس شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ رہی تھی۔
''کیا کر کے آئی ہیں؟'' اُس شخص نے عجیب دل گرفتی کے عالم میں حسنِ جہاں سے کہا تھا۔ پانی سیلاب کی طرح حسنِ جہاں کی آنکھوں میں اُمڈا تھا۔
''پیار کر کے آئی ہوں۔'' قلبِ مومن نے حسنِ جہاں کو کہتے سنا۔
اُس نے بہتے آنسوؤں کے ساتھ اپنی ماں کو ہنستے دیکھا۔ وہ اب اُس شخص سے لپٹی رو رہی تھی۔ وہ شخص بھی رو رہا تھا۔ صرف قلبِ مومن تھا جس کا دل اس وقت ببول کا کانٹا بن گیا تھا۔

☆☆☆

مومنہ کو لگا جیسے کسی چیز نے اس کے پیٹ میں مکا مارا ہو۔ وہ داؤد اور اقصیٰ سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ اُسے وہاں کیوں لائے تھے مگر اُس کی زبان پر وہ سوال نہیں آ رہا تھا۔ وہ بدترین خدشات کے درمیان جھولنے کی اس کیفیت سے جیسے باہر نکل آنے کی جرأت نہیں کر پا رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے جہانگیر کا چہرہ آ رہا تھا۔ درد اب پیٹ سے پسلیوں کی طرف چلا گیا تھا۔ اُس نے یاد ہونے کے باوجود انگلیوں کی پوروں پر وہ دن گنے جتنے دنوں سے اُس نے جہانگیر کی آواز نہیں سنی تھی..... چار دن..... اور ان چار دنوں میں اُسے اگر کچھ ہوا تھا تو اُسے پتا کیوں نہیں چلا تھا۔ اُس کی سانس کیوں نہیں رُکی تھی، اُس کا دل کیوں نہیں رُکا تھا؟
''مومنہ۔'' برابر بیٹھی اقصیٰ نے اُس کا نام پکارا۔ اُس نے میکانکی انداز میں گردن موڑ کر اُسے دیکھا۔ اقصیٰ یک دم اُس سے لپٹ کر رونے لگی تھی۔
''جہانگیر۔'' اُس نے بس ایک لفظ کہا تھا۔ مومنہ نے ایک بھی نہیں۔ سارے اندازے، قیافے اُس کی پوروں پر تھے۔ وہ جہانگیر کا نام نہ بھی لیتی تو بھی وہ جان گئی تھی، وہ کہاں تھا۔
گاڑی کی پچھلی سیٹ پر وہ کسی بت کی طرح بیٹھی رہی۔ اقصیٰ اُس سے لپٹی روتی رہی اور مومنہ سلطان اُسے دیکھتی رہی۔ اُسے رونا نہیں آ رہا تھا۔ آنسوؤں کو کچھ ہو گیا تھا۔ وہ خشک نہیں ہوئے تھے، بہنا بھول گئے تھے۔
داؤد نے اُس کی طرف کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اقصیٰ اُس سے الگ ہو گئی۔ مومنہ میکانکی انداز میں کھلے دروازے سے باہر آئی تھی اور اسی انداز میں ہی اُس نے مردہ خانہ کی طرف چلنا شروع کر دیا۔
اقصیٰ نے اُس کا ہاتھ پکڑنا چاہا، اُس نے پکڑنے دیا۔ داؤد اس کے پیچھے آیا تھا۔
مردہ خانہ کے دروازے سے باہر برآمدے کی سیڑھیوں میں اُس نے دیوار سے ٹیک لگائے زمین پر بیٹھے ثریا اور سلطان کو دور سے دیکھ لیا تھا۔
''تمہارے جانے کے بعد اگلے دن طبیعت خراب ہونا شروع ہوئی اُس کی لیکن وہ کہہ رہا تھا کہ تمہیں نہ بتائیں۔ آنٹی نے مجھے فون کیا تھا۔ ہم بڑی جگہ لے کر پھرتے رہے اُسے لیکن اُس کی حالت خراب ہوتی گئی۔ دونوں گردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا..... کل وہ.....'' اقصیٰ نے بات مکمل نہیں کی۔ اُس سے آگے جو کہنا تھا، وہ

مومنہ جانتی تھی۔ مگر اب جیسے وہ یہ سننا ہی نہیں چاہتی تھی۔
ثریا اور سلطان نے اُسے دور سے دیکھ لیا تھا۔ سلطان اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ بلند آواز میں رو رہا تھا
جیسے کوئی بچہ کسی بڑے کو دیکھ کر تسلی چاہنے والے انداز میں روتا ہے۔ مومنہ نے ثریا کو دیکھا، وہ وہیں بیٹھی تھی
کے ساتھ، گم صم۔ مومنہ کو دیکھ کر بھی نہیں اُٹھی تھی۔
"لاش نہیں دے رہے۔ کہتے ہیں پہلے ہسپتال کے بل کلیئر کرو۔" اپنی آنکھیں رگڑتے، روتے ہوئے
سے لپٹے سلطان نے کہا تھا۔ مومنہ سلطان کئی سالوں سے اس گھر کا کمانے والا مرد تھی..... اور زندگی میں
اُسے اپنے اس کردار پر رنج نہیں ہوا۔ اُس وقت وہاں کھڑے اُس نے زندگی میں پہلی دفعہ خواہش کی تھی
کمانے والی ذمہ داری کاش کبھی اُس کے کندھوں پر نہ ہوتی، کوئی اور ہوتا اسے نبھانے والا..... کوئی اور.....
جہانگیر..... اُس کی سوچوں کو جیسے بریک لگا تھا..... جہانگیر کا نام جیسے اُسے ایک بار پھر ہوش میں لے آیا تھا۔
"انکل! میں مل چکا ہوں اندر فائنانس والوں سے، آپ پریشان نہ ہوں..... ہو جائے گا کچھ نہ کچھ۔"
نے سلطان کو تسلی دی تھی۔ مومنہ باپ سے الگ ہو گئی..... رونے سے زیادہ بڑے کام کرنے تھے اُسے
رونے کے لیے تو زندگی پڑی تھی۔
"ابا! میں کرتی ہوں کچھ۔" مومنہ نے مدھم آواز میں باپ سے نظریں ملائے بغیر کہا۔ روتے بلکتے سلطان
کو عجیب قرار ملا۔ مومنہ جب بھی یہ جملہ بولتی تھی، کچھ نہ کچھ کر ہی لیتی تھی۔ وہ ثریا کے پاس نہیں گئی صرف اُسے
دیکھ کر رہ گئی تھی۔ ثریا نے بھی اُس سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔
"کتنا بل ہے؟" مومنہ نے پلٹ کر داؤد سے پوچھا۔

☆☆☆

"پونے تین لاکھ..... کیسے بنا دیا آپ نے اتنا بل۔" وہ بل کی رقم سن کر کراہ کر رہ گئی تھی۔ وہ اقصیٰ اور داؤد
کے ساتھ اس وقت بلز لیے ایڈمن آفس میں تھے اور وہاں موجود ڈاکٹر اُن سے بحث کر رہا تھا۔
"دیکھیں، یہ پرائیویٹ ہاسپٹل ہے۔ اس شہر کا سب سے بہترین ہاسپٹل..... آئی سی یو میں رکھا آپ کے
پیشنٹ کو، ڈائیلاسس ہوتا رہا۔ میڈیسنز اور انجکشنز دیے جاتے رہے۔ آپ کو سارا بریک ڈاؤن اس بل میں
جائے گا۔" وہ بڑے مشینی انداز میں اُنہیں تفصیلات بتا رہا تھا۔
"میں کلیئر کر دوں گی سارا بل..... لیکن ابھی نہیں کر سکتی۔ آپ اُسے لے جانے دیں۔ میں یہ سارا بل کلیئر
کر دوں گی۔" مومنہ نے منت سے کہا تھا۔
"مجھے آپ سے ہمدردی ہے لیکن یہ میرا ہاسپٹل نہیں ہے۔ میں بھی ملازم ہوں یہاں..... بل کلیئر ہونے
تک میں لاش آپ کے حوالے نہیں کر سکتا۔" ڈاکٹر نے بڑی نرمی لیکن بڑی صاف گوئی سے اُس سے کہا تھا۔
جہانگیر کے نام کی جگہ لاش کا لفظ سن کر مومنہ کچھ دیر کے لیے بھیج سکتے میں آئی تھی۔
"آپ ہمیں زیادہ نہیں بس تین چار دن کی مہلت دے دیں۔ میں گارنٹی کے طور پر اپنی گاڑی رکھوا جاتا
ہوں یہاں۔" اس بار داؤد نے مداخلت کرتے ہوئے ڈاکٹر سے کہا تھا۔
"دیکھیں آپ میری پوزیشن سمجھیں۔ یہ ہاسپٹل اس طرح کی ڈیلنگز نہیں کرتا اور گارنٹیز نہیں لیتا۔ آپ لوگ
کسی سے لون لے لیں ہم اور ٹائم دے دیتے ہیں آپ کو۔" ڈاکٹر نے اپنے سامنے رکھی ایک فائل کو بند کرتے
ہوئے کہا تھا۔
"اور ٹائم دیں گے لیکن اُسے لے جانے نہیں دیں گے؟" اس بار اقصیٰ نے کہا تھا۔ ڈاکٹر چپ رہا۔ مومنہ کو
یک دم ہوش آیا تھا۔ اپنا بیگ کھول کر اس نے وہ لفافہ ڈھونڈنا شروع کیا جس میں اُس کی فلم کا ایڈوانس کا چیک

تھا۔لفافہ مل گیا تھا۔

''یہ..... یہ ایک لاکھ کا چیک ہے..... آپ اس وقت یہ لے لیں..... باقی بھی کل پرسوں تک دے دیتی ہوں۔'' اُس نے لفافے سے وہ چیک نکال کر ڈاکٹر کی میز پر رکھا تھا۔

''یہ چیک آپ کے نام ہے۔ ہاسپٹل اس کا کیا کرے گا اور ہم لوگ ویسے بھی چیک میں نہیں کیش میں پے منٹ لیتے ہیں۔'' اُس ڈاکٹر نے چیک پیچھے کھسکاتے ہوئے اُس سے کہا تھا۔

''آپ افورڈ نہیں کر سکتے تھے یہ ہاسپٹل..... آپ کو لانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ یہ چند لاکھ تو بہت معمولی رقم ہے۔ یہاں تو اس سے بھی زیادہ رقم کے بلز لوگ ایک بھی سوال کئے بغیر پے کر کے جاتے ہیں۔'' اُس ڈاکٹر نے جیسے اُن کو اُن کی حیثیت کا احساس دلایا تھا۔

''زندگی بچانے کے لیے لائے تھے..... کسی بھی قیمت پر مل جاتی..... وہ آپ نے بچائی ہی نہیں..... مرنے کے لیے تھوڑی لائے تھے۔'' مومنہ کی آواز پہلی بار بھرائی تھی۔ اسے پہلی بار لگا وہ رو دے گی مگر آنسو صرف اُس کی آواز کو ہلا گئے تھے۔ اُس کی آنکھوں کو چھونے کی کوشش نہیں کی انہوں نے۔

''تم دیکھنا، میں یہ سب میڈیا پر دوں گی۔ سوشل میڈیا پر کمپین چلاؤں گی تمہارے ہاسپٹل کے خلاف..... تم لوگ گھٹیا اور کمینے ہو۔''

اقصیٰ یک دم آپے سے باہر ہو کر اُس ڈاکٹر اور اُس کے ساتھ بیٹھے فائنانس کے لوگوں پر چلائی تھی۔ مومنہ نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر دبایا یوں جیسے اُسے روکنا چاہتی ہو۔

''اُس سے کیا ہوگا میڈم..... زیادہ سے زیادہ ہماری بدنامی..... بدنامی سے بزنس تو ختم نہیں ہوتا بل تو پھر بھی ہاسپٹل والے لیں گے آپ سے..... وہ تو مجھ سے بھی لے لیتے اگر آپ کی جگہ میں ہوتا۔'' اُس ڈاکٹر نے جیسے نرم لفظوں میں اُسے اپنی حیثیت اور اوقات کا بھی احساس ڈھکے چھپے لفظوں میں کروایا۔

''میں ایکٹریس ہوں..... اپنے کام کو حلال بنانے کے لیے مر رہی ہوں پر آپ کو تو حلال کو بھی حرام بناتے ہوئے کوئی تکلیف، کوئی شرمندگی نہیں ہو رہی۔''

اقصیٰ کا ہاتھ پکڑے اُس نے ڈاکٹر سے کہا تھا۔ اُس آفس سے نکلتے ہوئے زندگی میں پہلی بار مومنہ سلطان کو اپنا پروفیشن اتنا حرام نہیں لگا تھا جتنا ہمیشہ لگتا تھا۔

☆☆☆

پتا نہیں اُس رات وہ کہاں کہاں پونے تین لاکھ کی رقم اکٹھا کرنے اقصیٰ اور داؤد کے ساتھ گئی تھی۔ جہانگیر کے پچھلے کئی سالوں سے ہونے والے علاج نے اُنہیں پہلے ہی بہت سے لوگوں کا مقروض کر رکھا تھا اور وہ کوشش کے باوجود بھی پرانا قرض ادا نہیں کر پائے تھے اور اب اس اچانک آجانے والے پونے تین لاکھ کی رقم کے بل نے جیسے مومنہ سلطان کا سارا دم خم نکال دیا تھا۔ اُس کے پاس کچھ دنوں کا وقت ہوتا تو وہ اس رقم کو اقصیٰ اور داؤد کے ساتھ مل کر کسی نہ کسی طرح پورا کر لیتی۔ مگر اُسے دو دن سے اُس مردہ خانہ میں پڑے ہوئے جہانگیر کو اب گھر لانا تھا۔ اُسے اپنے آخری گھر بھیجنا تھا تا کہ اُس کے ماں باپ کو کچھ سکون مل جاتا۔ مومنہ سلطان کے ہاتھ میں بس اب اتنا ہی سکون دینا رہ گیا تھا اُن کو۔

داؤد کی پرانے ماڈل کی اُس سوزوکی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی مومنہ سلطان نے شہر کی سڑکوں پر رات کو در بدر پھرتے پتا نہیں کس کس کو فون کیا تھا..... بڑی بڑی رقموں کے لیے نہیں..... چھوٹی چھوٹی رقموں کے لیے..... تین..... پانچ..... سات..... اُس کا حلقہ احباب اتنی ہی رقم قرض میں دے سکتا تھا۔ کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھی جانے والی ہر رقم اُس کی زندگی کے گلاس کو پانی کے قطروں کی طرح بھر رہی تھی۔ عزت نفس اور خودداری کو وہ مردہ خانہ کے باہر بیٹھے ہوئے

سلطان اور ثریا کے پاس چھوڑ آئی تھی..... تاکہ وہ کم از کم اس رات مومنہ سلطان کے پیروں کی زنجیر نہ بنیں جنہوں ہمیشہ اُسے جہانگیر کی زندگی اور علاج کے لیے اس طرح پیسے جمع کرنے سے روکے رکھا تھا۔

"دیکھو مومنہ! ابھی تمہیں ایک لاکھ دیا گیا ہے ایڈوانس میں اور اب تم چاہ رہی ہو کہ مزید رقم دی جائے ممکن نہیں ہے۔ اور میری تمہیں ایڈوائس ہے کہ اس اسٹیج پر اس طرح کے مطالبے نہ کرو ورنہ پروڈکشن ہمیں نکال دے گی اس فلم سے..... یہ بڑے پروفیشنل لوگ ہیں۔ پاکستانی بہانے اور جھوٹ نہیں مانتے یہ۔"

اُس نے اس فلم کے کاسٹنگ ایجنٹ کو فون کیا تھا۔ جو فلم وہ سائن کر کے آئی تھی اور اُس نے فون پر ہی اُس پوری بات سنے بغیر فون یہ کہتے ہوئے بند کر دیا تھا۔ "میں کچھ کیسز کے ساتھ ہوں تم سے کل بات کروں گا۔"

مومنہ کو کچھ محسوس نہیں ہوا۔ نہ کوئی ہتک نہ کوئی ذلت..... جس کرب میں وہ تھی، وہ اُس کے باقی احساس کھا گیا تھا۔

"ہو جائیں گے اکٹھے مومنہ! ہو جائیں گے۔ تم پریشان نہ ہو..... ہم کر رہے ہیں کوشش۔ فوری طور بن نہیں پا رہا ورنہ داؤد اپنی گاڑی بیچنے کی بات کر چکا ہے کتنے لوگوں سے کل سے..... تم دُعا کرو کوئی فوراً منٹ پر تیار ہو تو گاڑی ہی بیچ دیں۔ سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔" اُس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی ہوئی اپنے فون سے کالز کرتے ہوئے مسلسل اُسے تسلیاں دے رہی تھی۔

"اسلم بھائی سے بھی بات کرتی ہوں اگر اُن سے کچھ مل جائیں۔"

مومنہ نے جواباً فون پر ایک اور نام ڈائل کرنا شروع کر دیا یوں جیسے وہ تسلی اُس نے سنی ہی نہ ہو۔ اقصیٰ کال کرتے کرتے اُس کا چہرہ دیکھا۔ مومنہ کے چہرے پر کچھ نہیں تھا..... کچھ بھی۔ وہ صرف کال ملا کر فون سے لگائے اب اسلم بھائی سے بات کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"اسلم بھائی کچھ قرض چاہیے۔" دوسری طرف اسلم بھائی کی آواز سنتے ہی اُس نے چھوٹتے ہی کہا تھا۔

"ایک تو میرے ہر آرٹسٹ کو میرے ہی سوپ میں قرض کی ضرورت پڑتی ہے۔ بینک سمجھ لیا ہے تم لوگ مجھے۔ اب تم بتاؤ، کون سا پلاٹ خریدا ہے جس کی قسط دینی ہے۔" انہوں نے دوسری طرف سے جھلا کر کہا تھا۔

"جہانگیر مر گیا اسلم بھائی..... اُس کی لاش لینی ہے ہاسپٹل سے..... بلز کلیئر کرنے ہیں۔"

مومنہ نے چند گھنٹوں میں درجنوں بار دہرایا ہوا جملہ اُسی میکانکی انداز میں ایک بار پھر دُہرایا تھا۔

دوسری طرف اسلم بھائی کچھ دیر بول ہی نہیں سکے تھے پھر انہوں نے کچھ گڑبڑائے ہوئے انداز میں

"اوہ! یہ تو بڑے دُکھ کی خبر ہے..... کتنے پیسے چاہئیں؟"

"آپ جتنے بھی دے سکیں۔" مومنہ نے اُسی انداز میں کہا۔

"میں اس وقت شوٹ پر ہوں..... نکل نہیں سکتا ابھی یہاں سے..... مگر تم آ جاؤ..... کرتا ہوں شوٹنگ لوکیشن کا تو پتا ہے نا؟"

"جی اسلم بھائی..... میں آ جاتی ہوں وہاں۔" اُس نے جواباً کہتے ہوئے فون بند کیا اور کانٹیکٹ لسٹ سے اگلا نمبر ڈھونڈتے ہوئے بڑبڑانے لگی۔

"اب کس کو کال کروں..... کس کو کروں۔" اقصیٰ کا دل کٹنے لگا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اُس سے کہے۔ وہ اب داؤد کو اُس لوکیشن کا پتا بتا رہی تھی جہاں اسلم بھائی شوٹ پر تھے۔

"تم قلب مومن سے بات کرو، وہ اگر کچھ کر دے۔" اقصیٰ کو یک دم دوبارہ خیال آیا۔

"کل بھی سارا دن اُن سے بات کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں لیکن وہ مصروف تھے آج بھی کتنی دفعہ کر چکا ہوں فون نہیں اٹھا رہے۔" داؤد نے گاڑی کو اُس سڑک پر ڈالتے ہوئے کہا جس کا پتا مومنہ نے بتایا تھا

"ان کی کوئی پارٹی چل رہی ہوگی۔ وہ ایسے ہی ہیں مرضی سے بات کرتے ہیں۔" داؤد بڑبڑایا تھا۔ "اور میں نے تو پہلے ہی کچھ قرضہ لیا ہوا ہے۔ اُن سے اب پتا نہیں اس بار وہ کچھ دیتے بھی یا نہیں۔" اقصیٰ خاموش رہی۔

اُس ایڈریس پر پہنچتے ہی مومنہ میکانکی انداز میں گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اُتر کر چلی گئی تھی۔

"یہ روکیوں نہیں رہی۔" داؤد نے دور جاتی مومنہ کو دیکھ کر مضطرب انداز میں اقصیٰ سے کہا تھا۔

"حوصلہ دکھا رہی ہے۔" اقصیٰ نے ناک ٹشو سے رگڑتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اتنے حوصلے کا کیا کرنا ہے اس نے...... اس سے کہو کہ روئے۔" داؤد نے جواباً اُس سے کہا تھا۔

وہ دس منٹ بعد دوبارہ نمودار ہوئی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اُس نے ہاتھ میں پکڑا لفافہ اقصیٰ کو دیتے ہوئے کہا تھا۔

"یہ دس ہزار ہیں...... سات ہزار جبار بھائی بھی دیں گے۔ اُن کا گھر اسی لین میں ہے۔" اُس نے ہاتھ سے داؤد کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اقصیٰ نے یک دم اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مومنہ نے چونک کر اُسے دیکھا۔

"تم رو لو مومنہ۔" وہ اقصیٰ کو چند لمحے دیکھتی رہی پھر اُس نے کہا۔

"پیسے پورے ہو جائیں پھر رو لوں گی۔" اقصیٰ سے اُس نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا تھا۔

☆☆☆

"اللہ ناس مارے ان ہسپتال والوں کا...... دیکھنا کیسے کیڑے پڑیں گے انہیں۔" جھومر نے اپنے دوپٹے سے اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے سلطان سے کہا۔ سلطان رات کے اس پہر اپنی گلی سے پیسے اکٹھے کرنے آیا تھا۔

"لاکھ کیڑے پڑ جائیں جھومر...... میرا جہانگیر تو نہیں آئے گا۔"

سلطان نے روتے ہوئے اُس سے کہا تھا۔ جھومر نے دوپٹے کے پلّو سے بندھے پیسے کھول کر نکالتے ہوئے سلطان کو تسلی دی۔

"بس کر سلطان بھائی! یہ پندرہ سو رکھ لے۔ میں نکلتی ہوں ابھی پھر رات کو...... جو کمائی ہوتی ہے وہ بھی لا کر دیتی ہوں تجھے...... ہسپتال میں ہی آ کے دے جاتی ہوں...... تو اب وہیں رہ۔" جھومر نے سو سو کے خستہ حال نوٹ اُس کی مٹھی میں دباتے ہوئے کہا۔

"تیرا شکریہ کیسے ادا کروں جھومر۔" سلطان نے سسکیاں لیتے ہوئے اُس سے کہا تھا اتنے سالوں میں جھومر اور اُس کے درمیان کبھی شکریہ کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ہمیشہ تو تڑاخ اور گالم گلوچ میں ہی بات ختم ہوتی تھی۔ وہ اکثر اُس سے میک اپ کراتا اور بغیر پیسے دیے نکلتا چلا جاتا یا سلطان اُس کا مذاق اڑاتا تو وہ گلی میں کھڑا ہو کر اُس کے پورے خاندان کو کوستا، مومنہ باجی کے علاوہ جس کا وہ فین تھا...... اور آج جہانگیر چلا گیا تھا تو جیسے سب کی طرح وہ بھی مرہم رکھنے چلا آیا تھا۔

"چھوڑ سلطان بھائی...... میرا تو جنازہ بھی جائز نہیں...... پر جن کا جائز ہے، اُن کا تو جنازہ ہو...... میں آتی ہوں پھر۔"

وہ کہتے ہوئے اسی طرح مٹکتا ہوا چلا گیا تھا۔ سلطان کو اُس لمحے جھومر کے سامنے وہ پورا معاشرہ ہیجڑا لگا جس کا وہ حصہ تھا۔

☆☆☆

مومنہ نے ثریا کو چونک کر دیکھا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے یک دم کچھ گنگنا رہی تھی۔ مومنہ اور اقصیٰ ابھی کچھ دیر پہلے ہی واپس ہاسپٹل آئی تھیں اور داؤد پونے تین لاکھ میں سے باقی رہ جانے والے پچاس ہزار کسی سے مانگنے گیا تھا۔ سلطان وہاں نہیں تھا اور وہ اور اقصیٰ برآمدے کی زمین پر بیٹھے اکٹھے ہونے والے سارے لفافوں اور نوٹوں کو ایک آخری بار دوبارہ گن رہی تھیں، یوں جیسے کوئی سلامی کے لفافوں سے نوٹ نکال نکال کر گنتا ہے۔

ثریا اُسی طرح اُن سے بے نیاز برآمدے کی دیوار کے ساتھ سر ٹکائے گنگنا رہی تھی۔ وہ ایک لوری تھی۔ مومنہ اور اقصیٰ نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر مومنہ اپنی گود میں رکھے ہوئے سارے نوٹ اقصیٰ کی گود میں ڈال کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''اماں! کیا گا رہی ہیں آپ۔'' ثریا کے پاس بیٹھ کر اُس نے ثریا کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا تھا۔

ثریا کے بال لٹوں کی شکل میں اُس کی چٹیا سے نکل کر بکھرے ہوئے تھے اور اُس کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ اُس نے مومنہ کو دیکھا۔

''جب چھوٹا تھا نا تو دوسرے بچے لوری سن کر سوتے تھے، یہ اُٹھ جاتا تھا..... شاید اب بھی.....'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر پھر لوری گانے لگی تھی۔

''للا للا لوری..... دودھ کی کٹوری۔''

مومنہ، ثریا کا چہرہ پلکیں جھپکائے بغیر دیکھتی رہی۔ اُس کے ماں باپ ہمیشہ جہانگیر کے عشق میں مبتلا رہے تھے۔ جہانگیر کے سامنے اُن کے لیے مومنہ کچھ بھی نہیں تھی اور مومنہ نے ساری زندگی اس تفریق کو برا مانے بغیر سہا۔ جہانگیر چاہے جانے کے قابل تھا وہ شاید نہیں تھی یا وہ یاد رہ جانے والوں میں سے تھا، وہ نہیں تھی۔ وہ دلوں کو مٹھی میں کر لینا جانتا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی..... اگر زندگی جہانگیر سلطان کو موقع دیتی تو وہ لاکھوں کروڑوں دلوں پر ہیرو بن کر حکمرانی کرتا۔ صرف سلطان اور ثریا کا یقین نہیں تھا۔ مومنہ سلطان بھی یہ ماننے والوں میں سے تھی اور اگر سب کچھ ویسا ہوتا تو وہ بڑی خوشی سے جہانگیر کے سائے میں زندگی گزار لیتی..... اُس کے لیے تالیاں بجاتے ہوئے۔ اُس کی کامیابیوں اور فتوحات کو اپنا مانتے ہوئے، اس کی ناموری پر راضی..... مگر یہ سب کچھ زندگی نے ہونے نہیں دیا تھا یا شاید موت نے۔

ثریا کا چہرہ دیکھتے ہوئے، وہ وہ الفاظ ڈھونڈتی رہی جن سے وہ ثریا کو یہ سمجھا سکتی کہ وہ، یہ لوری نہ گائے..... جہانگیر اب کبھی نہیں اُٹھے گا۔

PakiBooks.Site

''جھولا جھلاؤں گی
تجھے جھولا جھلاؤں گی
تجھے جھولا جھلاؤں گی۔''

''مومنہ۔'' ایک ہی مصرعے کو بار بار گاتی ثریا کو دیکھتے ہوئے مومنہ کو اقصیٰ نے پکارا تھا۔ داؤد آ گیا تھا۔ اور اُس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ مومنہ کو دکھاتے ہوئے اُس نے کہا۔

''پورے ہو گئے پیسے..... مجھے لگتا ہے۔''

وہ تینوں زمین پر آلتی پالتی مارے ایک بار پھر اُن پیسوں کو گن رہے تھے جب فجر کی اذان ہونے لگی۔

''دو لاکھ ستاسی ہزار۔'' داؤد نے بالآخر آخری نوٹ گنتے ہوئے کہا۔ مومنہ کو لگا وہ جیسے وہ شہزادی تھی جس کے جسم میں گاڑی ہوئی سوئیاں وہ سارے نوٹ نکال رہے تھے اور آخری سوئی اُس آخری رقم سے نکلی تھی۔ وہ اب جہانگیر کو گھر لے جا سکتی تھی تاکہ ثریا وہ لوری نہ گائے۔

داؤد پیسے لے کر اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مومنہ برآمدے کے ٹھنڈے فرش پر چت لیٹ گئی تھی۔ یوں جیسے بہت لمبی ریس میں دوڑنے والا افتتاحی لائن کو پار کرنے کے بعد زمین پر گرتا ہے، وہ بھی جیسے جیت ریس کوئی اور جیت چکا ہو۔

''مومنہ! تم رو لو۔'' اقصیٰ نے اُس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تھا۔

وہ بہت دیر خاموش رہنے کے بعد بڑبڑائی۔

''اب کس بات پر رونا ہے۔'' اقصیٰ بول نہیں سکی۔

☆☆☆

قلب مومن نے نیہا کو اپنے کسی کلائنٹ کے ساتھ اپنے بوتیک اسٹوڈیو میں بیٹھے دیکھا۔ وہ اُس کے ساتھ اُس کا برائیڈل ڈسکس کر رہی تھی۔ قلب مومن ٹہلتے ہوئے ڈسپلے پر لگے برائیڈل لز دیکھنے لگا۔ نیہا نے اُسے دیکھ لیا تھا، لیکن وہ مکمل طور پر اُسے نظر انداز کرتے ہوئے اپنے کام میں مصروف رہی۔ اُس کے بوتیک اسٹوڈیو کا وہ حصہ جو آفس کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ گلاس پارٹیشن سے بوتیک کے باقی حصہ سے الگ کیا گیا تھا۔ مومن وہاں ہونے والی گفتگو نہیں سن سکتا تھا لیکن اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ نیہا کو کلائنٹ کو فارغ کر دینے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ تقریباً دس منٹ وہاں ٹہلتا رہا اور بالآخر جب وہ کلائنٹ باہر نکلی تو وہ آفس میں داخل ہوا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے نیہا کو دیکھا، اُس نے جواباً بے تاثر چہرے کے ساتھ اُس سے کہا۔ ''میں کلائنٹ کے ساتھ میٹنگ میں تھی۔''

''میں نے تمہیں انٹرپٹ نہیں کیا۔'' مومن نے جواباً کہا۔ وہ اب ایک کرسی سنبھال کر بیٹھ چکا تھا۔ ''ویٹ کرنا چاہیے تھا تمہیں، میں بلاتی تب اندر آنا چاہیے تھا۔'' نیہا کا لہجہ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ مومن بے اختیار ہنسا اور میز پر دونوں بازو پھیلا کر، کچھ آگے جھکتے ہوئے بولا۔

''ناراضی ختم کرو اب۔''

''نہیں، میں کیوں ناراض ہوں گی تم سے اور ہوں گی بھی تو تمہیں کیا پروا؟'' نیہا نے جواباً اُسی نروٹھے انداز میں کہا۔

''پروا ہے تو یہاں بیٹھا ہوں نیہا! تم نے ضوفی کا میری فلم میں کام کرنا ضد کیوں بنا لی ہے اپنی۔'' وہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''ضد؟ خواہش ہے میری۔ تم ضد سمجھ رہے ہو تو ایسا ہی سہی۔'' نیہا نے اُسی تیکھے لہجے میں کہا۔

''تمہارے اور میرے تعلق میں ضوفی نہیں آنا چاہیے۔'' مومن کی خفگی بڑھی۔

''تمہارے اور میرے تعلق میں ضوفی نہیں ہے مومن..... تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ تم اپنے علاوہ کسی کو کچھ نہیں سمجھتے..... تمہاری ''میں'' بہت بڑی ہے..... تمہاری ناک اس سے بھی زیادہ۔'' اُس نے بڑی تلخی سے مومن کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ وہ بپھنے آیا تھا۔ وہ رگیدنے لگی تھی۔

''میں ایسا ہی ہوں نیہا..... میں ہمیشہ سے ایسا ہی تھا..... آج ایسا نہیں ہوا۔'' مومن نے شہد کی طرح اُس کے زہریلے جملوں کا گھونٹ بھرا تھا۔

''میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی۔'' اُس کے جملے نے مومن کو تکلیف پہنچائی۔

''تم مجھے ہرٹ کر رہی ہو۔'' اُس نے نیہا سے کہا۔ وہ جواباً استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

''نہیں یہ کام تو تمہارا ہے..... کوئی دوسرا کیسے کر سکتا ہے؟''

''میں تمہیں منانے آیا تھا آرگیو کرنے نہیں۔'' مومن اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی ہمت جیسے جواب دے گئی تھی۔

''ضوفی تمہاری فلم میں لیڈ رول کرے گا تو تمہارے اور میرے درمیان سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا ورنہ..... اٹس آل اوور (سب ختم)۔''

مومن نے بے یقینی سے اُسے دیکھا۔

''تمہارے نزدیک ضوفی ہمارے رشتے سے زیادہ اہم ہے؟''

''نہیں، مجھے یہ دیکھنا ہے کہ تمہارے لیے تمہاری ضد اہم ہے یا میں۔''

وہ اُس کے بعد وہاں رُکا نہیں تھا۔ وہ لہجہ، وہ انداز، جملے اُس نے پہلی بار نیہا کے منہ سے سنے تھے اور اگر قلب مومن کو شاک لگا تھا تو یہ غیر متوقع نہیں تھا۔ وہ کسی دوسرے مرد کے لیے اُس سے لڑ رہی تھی۔ اُسے چھوڑ دینے پر تیار تھی۔ قلب مومن کے لیے یہ ہتک آمیز تھا اور ہتک کو برداشت کرنا مومن کی گھٹی میں نہیں تھا۔

☆☆☆

''دادا جی! مومن بھائی کی شادی کر دیں اب۔''
شکور عبدالعلی کے کمرے میں ہی فرش پر کپڑا بچھائے اُن کے کپڑے استری کر رہا تھا جب کپڑے استری کرتے کرتے اُس نے یک دم عبدالعلی سے کہا۔ وہ چونک کر مسکرائے۔
''بیٹھے بٹھائے تمہیں اُس کی شادی کا خیال کیسے آ گیا؟''
''بس دادا جی! جب چوبیس گھنٹے پارٹیاں ہوں اور لڑکیاں آئیں تو پھر شادی کا مشورہ ہی دے گا نا کوئی بھی شریف آدمی۔'' شکور قمیص کی کریز بناتے ہوئے بولا اور پھر اچانک اُسے احساس ہوا، عبدالعلی چپ ہو گئے تھے۔ اُسے اچانک احساس ہوا، وہ کچھ غلط بات کر گیا تھا۔
''ویسے مومن بھائی ہیں بڑے شریف آدمی..... لیکن لڑکیاں نہیں ناں اچھی آج کل کی۔'' اُس نے فوراً ہی کچھ گڑبڑائے ہوئے انداز میں تصحیح کی۔
''شریفوں کو بھی خراب کر دیتی ہیں..... اب مومن بھائی کو نہ بتائیے گا یہ ساری باتیں..... ان کو پہلے ہی شبہ رہتا ہے کہ میں اُن کی باتیں لوگوں کو بتاتا ہوں حالانکہ آپ خود دیکھ لیں، آپ کتنے دنوں سے یہاں ہیں، میں نے کوئی ایک بھی بات بتائی ہے آپ کو مومن بھائی کی۔''
شکور نے بڑے فخریہ انداز میں جیسے اُن سے تصدیق چاہی تھی۔ عبدالعلی گنگ تھے۔
''نہیں، تم نے تو کچھ بھی نہیں بتایا۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بڑبڑائے جیسے بہت پریشان ہوئے تھے۔ شکور اُن کے تصدیقی جملے پر بے اختیار خوش ہوا۔
''یہی باتیں تو اچھی لگتی ہیں مجھے آپ کی دادا جی..... آپ بڑے سچے آدمی ہیں..... ویسے آپ کو ایک بات بتاؤں۔ مومن بھائی آپ سے ڈرتے بڑا ہیں۔'' اُس نے جیسے کوئی انکشاف کیا۔
''مجھ سے ڈرتا ہے؟'' عبدالعلی حیران ہوئے۔
''وہ تو کبھی بچپن میں بھی مجھ سے نہیں ڈرا۔'' انہیں پتا نہیں کیا یاد آیا تھا۔
''نہیں نہیں سچ میں..... آپ سے بہت ڈرتے ہیں۔ اسی لیے تو ساری ایسی ویسی تصویریں اور مجسمے اسٹور میں رکھوا دیے ہیں انہوں نے..... بلکہ فریج میں سے اُس چیز کی بوتلیں بھی ہٹوا دی ہیں انہوں نے..... اور کین بھی..... وہ ''اُس چیز'' کے دادا جی..... آپ سمجھ تو گئے ہوں گے نا دادا جی۔''
شکور نے شراب کا نام لیے بغیر اپنے لفظوں پر معنی خیز انداز میں زور دیتے ہوئے عبدالعلی کے جسم میں سے جیسے جان نکالی تھی۔ قلبِ مومن بھٹک رہا تھا اور وہ بے بس تھے، کس کو پکارتے۔ کس سے کہتے..... قلبِ مومن کے سامنے بیٹھ کر سوال جواب کیے تو عرصہ ہو گیا تھا اُنہیں۔
''تم مومن کے لیے دعا کیا کرو شکور۔'' عبدالعلی کے لہجے میں رنجیدگی تھی۔
''کیا دعا؟ سارا کچھ تو ہے ان کے پاس دادا جی۔'' شکور نے حیرانی سے کہا۔ عبدالعلی چاہتے ہوئے بھی زبان پر وہ دعا نہیں لا سکے جو وہ مومن کے لیے چاہتے تھے۔ قلبِ مومن کا پردہ کہاں کھولنے والے تھے وہ..... کھولتے بھی تو بس ایک ہی شخص کے سامنے کھول سکتے تھے۔

☆☆☆

ماسٹر ابراہیم کے ہاتھ جوتے مرمت کرنے والے لوہے کے اُس اسٹینڈ پر دھرے ایک بے حد قیمتی نازک اور بے حد نفیس ہیل والے جوتے پر اپنے اوزار کے ساتھ مشینی انداز میں چل رہے تھے۔ وہ فرش پر بیٹھے تھے اور اُن سے کچھ فاصلے پر ان کی جوتوں کی مرمت کی اُس دکان میں دھرے ایک بینچ پر جینز میں ملبوس ایک نوجوان لڑکی اپنے مہندی رچے ہاتھوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اور بے حد بے چین انداز میں بولتی جا رہی تھی۔ ماسٹر ابراہیم

اُس کی باتیں خاموشی سے سنتے ہوئے اپنے کام میں مشغول تھے۔
''ہو جائے گا نا ٹھیک.....؟ جوتے کو کچھ ہو گیا نا تو میری ویڈنگ خراب ہو جانی ہے۔ اب دو دن میں ایسا جوتا کہاں سے ڈھونڈوں گی میں..... کہا بھی تھا گیتی کو کہ میرے سائز کا مسئلہ نہ ہو جائے مگر وہ کہہ رہی تھی نہیں، پرفیکٹ ہے۔ ایسا جوتا لاؤں گی کہ لوگ سنڈریلا کے سینڈلز کو بھول جائیں گے اور اب دیکھیں.....''
وہ شاید اسی رفتار سے بولتی جاتی مگر ماسٹر ابراہیم نے اُس کے جوتے کو اُس کے پیروں کے پاس رکھ کر اپنے اوزار سمیٹتے ہوئے کہا۔
''ہو گیا..... آپ دیکھ لیں۔''
لڑکی نے جیسے کچھ بے یقینی سے اُنہیں دیکھا اور پھر جوتے پہن کر وہ کھڑی ہو کر دو قدم چلی اور اُس نے بے اختیار دونوں ہاتھ خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے اپنے منہ پر رکھے۔
''مائی گڈنیس، یہ تو بالکل فٹ ہو گیا..... آپ نے کیسے کر دیا..... یہ تو اٹلی سے آیا ہے..... کوئی ایسے ہاتھ نہیں لگا رہا تھا..... کہ بہت مہنگا ہے۔ ہم ذمہ داری لے کر نہیں کر سکتے۔'' وہ لڑکی اب جوتا اُتارتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
''میں اس کمپنی میں کام کرتا تھا۔'' ماسٹر ابراہیم نے سر جھکائے مدھم آواز میں کہا۔ وہ اب اُس لڑکی کے پیروں سے اُتارے ہوئے جوتے کو اُس بیگ میں ڈال رہا تھا۔ جن میں ڈال کر وہ اُسے لائی تھی۔
''کس کمپنی میں؟'' لڑکی جیسے سمجھ نہیں پائی۔
''جس کمپنی کے یہ سینڈلز ہیں۔ Sergio Rossi۔'' ماسٹر ابراہیم نے بے حد عام سے لہجے میں کہا تھا۔
''اٹلی میں؟'' لڑکی کو جیسے کرنٹ لگا تھا سن کر۔
''میلان میں۔'' ماسٹر ابراہیم نے جیسے مزید تصحیح کی۔
''آئی ڈونٹ بلیواٹ۔'' لڑکی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔
''اٹھارہ سو روپے۔'' ماسٹر ابراہیم نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔
''کس چیز کے۔'' لڑکی نے بے ساختہ کہا۔
''اس کی مرمت کے..... سائز ٹھیک کرنے کے۔''
''پانچ سو دوں گی۔'' اُس لڑکی نے پانچ سو کا نوٹ بیگ سے نکال کر ماسٹر ابراہیم کو تھمایا تھا اور وہ ہنس پڑے تھے۔ کچھ کہے بغیر انہوں نے خاموشی سے پانچ سو کا وہ نوٹ پکڑ لیا اور تب ہی اُس لڑکی کے عقب میں کھڑے عبدالعلی کو انہوں نے دیکھا تھا۔
وہ بے اختیار پانچ سو کا نوٹ چھوڑ کر کھڑے ہوئے تھے۔
''عبدالعلی صاحب۔'' اُن کے منہ سے نکلا تھا۔ اُس لڑکی نے فرش پر گرے پانچ سو کے نوٹ اور اُس ترکش بوڑھے سے ملتے اُس جوتے مرمت کرنے والے ماسٹر ابراہیم کو دیکھا جو چند لمحے پہلے میلان میں Sergio Rossio کی کمپنی میں کام کرنے کا دعوا کر رہا تھا اور جس نے اُس کے لاکھوں مالیت کے اُس جوتے کو واقعی کمال مہارت سے ٹھیک کیا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ یہ ماننے پر تیار نہیں تھی کہ وہ Sergio Rossio میں کام کر چکا ہوگا..... دکان سے نکلتے ہوئے اُس نے سوچا تھا، پوچھوں گی اُس سے جس نے یہاں بھیجا تھا۔ اُسے اپنی اُس ماڈل دوست کا خیال آیا جس کے توسط سے وہ یہاں آئی تھی۔

☆☆☆

''آپ نے تو اس بار حیران ہی کر دیا مجھے..... آنے سے پہلے بتایا ہی نہیں۔''
اپنی حویلی کا دروازہ کھول کر عبدالعلی کو اندر لاتے ہوئے ماسٹر ابراہیم نے اُن سے کہا تھا۔ وہ اب اُن کے

ساتھ حویلی کے صحن میں دانہ چگتے ہوئے کبوتروں کے درمیان سے گزر رہے تھے اور وہ کبوتر ڈر کر اُڑنے کے بجائے وہیں بیٹھے بیٹھے اِدھر اُدھر سرک رہے تھے۔

''میں نے سوچا، اس بار تمہیں اپنے پاس بلانے کے بجائے تمہارے گھر جا کر ملوں تم سے۔'' عبدالعلی نے مسکراتے ہوئے حویلی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا تھا۔ وہ اب برآمدے میں داخل ہو چکے تھے۔

''تو یہ ہے تمہارا ٹھکانا۔'' ماسٹر ابراہیم نے ایک کرسی اُنہیں بیٹھنے کے لیے دیتے ہوئے کہا۔

''میری کُٹیا، بیٹھیں آپ۔''

''بڑی مشکل سے ملی تمہاری دکان..... کوئی تمہیں جانتا ہی نہیں۔'' عبدالعلی بیٹھتے ہوئے بولے تھے۔

''آپ نے موچی نہیں کہا ہوگا ورنہ فوراً مل جاتا۔''

ماسٹر ابراہیم نے ہنس کر کہا تھا۔

''ہاں، یہ غلطی ہوگئی مجھ سے۔ میں ماسٹر ابراہیم کہہ کر اٹلی کا حوالہ دیتا رہا۔'' انہوں نے پانی کا وہ گلاس پکڑا جو ماسٹر ابراہیم اُنہیں دے رہے تھے۔ ماسٹر ابراہیم اُن کی بات پر مسکرائے تھے۔

''میں آپ کو اس لیے بار بار اس حویلی میں لانا چاہتا تھا تاکہ اسے بھی آپ کے قدموں کی سعادت نصیب ہو۔'' ماسٹر ابراہیم نے اُن سے کہا۔ وہ اب برآمدے کی الماری کی ایک دراز کھول رہے تھے۔

''میرے آئے بغیر بھی یہ حویلی بے حد برکت اور سعادت والی ہے۔ یہاں مجھ سے بہتر لوگ رہتے ہیں..... میرے کام سے بڑا کام ہو رہا ہے۔'' عبدالعلی نے پانی کا ایک گھونٹ پیا پھر کہا۔

''گناہ گار نہ کریں عبدالعلی صاحب! آپ سے بہتر کیا ہوں گے ہم..... ہاں کام شاید اللہ ہماری اوقات سے بڑھ کر ہم سے کروا رہا ہے مگر یہ بھی میری بیوی کا کمال تھا۔ میرا نہیں..... اُسی پر عنایت تھی اللہ کی..... میں تو صرف وسیلہ بنا۔'' ماسٹر ابراہیم عجیب سی کیفیت میں کہہ رہے تھے اور عبدالعلی کی آنکھوں میں نمی جھلکی تھی۔

''یہ دیکھیں آپ کا تحفہ۔'' عبدالعلی کے سامنے یک دم وہ کیس لے کر آئے جو انہوں نے اُس الماری سے نکالا تھا۔ عبدالعلی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ وہ اُس کیس کو کھول کر اُس میں اپنے ہاتھ سے خطاطی کیا ہوا وہ قرآن پاک دیکھ رہے تھے جو انہوں نے کئی دہائیوں پہلے ماسٹر ابراہیم کو دیا تھا۔

''ماشاء اللہ۔ تم نے خوب سنبھال رکھا ہے۔'' انہوں نے اُس کے اوراق پلٹتے ہوئے کہا۔

''سنبھالتی تو اس کو میری بیوی تھی، وہ تلاوت کیا کرتی تھی روز اس سے۔ اب اُس کے جانے کے بعد یہ ذمہ داری میں نے سنبھال لی اور ایک بچی آتی ہے میرے پاس مومنہ۔ وہ تلاوت کرتی ہے اس سے..... جو چھوٹی موٹی مرمت ہے اُسی نے کی ہے اس کی جلد پر.....''

وہ عبدالعلی کو چمڑے کی جلد پر کیے ہوئے وہ خطاطی کے نقش و نگار دکھا رہے تھے جو مومنہ سلطان کے ہاتھ کے بنائے ہوئے تھے۔ عبدالعلی کو پتا نہیں کیا یاد آیا تھا۔ انہوں نے جیب سے رومال نکال کر اپنے آنسو خشک کیے تھے۔

''آپ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اس نسخے نے زندگی بدل دی تھی میری..... کیسے سنبھال کر نہ رکھتا اسے۔'' ماسٹر ابراہیم اب اُس قرآن پاک کو اُن کے ہاتھوں سے واپس لیتے ہوئے اُسے دیکھ کر جیسے خود ماضی میں جا رہے تھے۔

''پہلی بار جب کسی نے یہ نسخہ مجھے دے کر کہا تھا کہ ہاتھ سے لکھا ہوا ہے تو میں نے سوچا تھا۔ ماسٹر ابراہیم تو نے ریمپ پر چلتی عورتوں کے جوتے بنا بنا کر ساری عمر گنوا دی..... ملا کیا..... پیسہ..... بس..... اور ایک یہ شخص ہے جس نے زندگی کے سال لگا کر جنت کمالی..... بس دماغ ہی اُلٹ گیا میرا..... آپ کو یاد ہے کیسے ڈھونڈتا ہوا پہنچا تھا میں آپ کو تُرکی میں۔'' انہوں نے ایک گہرا سانس لیا تھا۔ اپنی بھر آئی ہوئی آواز کو ٹھیک کرنے کے لیے۔

''ہاں اور میرے لیے لائے تھے..... اٹلی کے جوتے۔ پیرس کے پرفیومز اور میلان کے سوٹ۔'' عبدالعلی

جیسے کچھ یاد کر کے ہنسے۔

"جو میری اوقات تھی، میں تو وہی لا سکتا تھا نا۔ حیران ہو گیا تھا اُس وقت آپ کو اُردو بولتے دیکھ کر۔"

"اپنے پوتے کے لیے سیکھ رہا تھا تب۔" وہ دونوں جیسے ماضی میں پہنچے ہوئے تھے۔

"قلبِ مومن کیسا ہے؟" ماسٹر ابراہیم نے یک دم پوچھا۔ عبدالعلی نے ایک نظر ماسٹر ابراہیم کو دیکھا پھر جیسے کوئی دُھند اُن کی آنکھوں میں آئی تھی۔

"جیسے کبھی تم تھے۔" اُن کی آواز میں عجیب ندامت تھی۔ ماسٹر ابراہیم بے اختیار ہنسے۔

"یعنی منجدھار میں ہے...... نکل آئے گا باہر۔"

"عبدالعلی بڑا گناہ گار انسان ہے ماسٹر ابراہیم...... یہ آزمائشیں اسی لیے آتی ہیں مجھ پر...... اللہ کا نام لکھتے ہوئے کوئی کوتاہی، کوئی بے ادبی ہو گئی ہو گی مجھ سے۔" اُن کے گالوں پر آنسو بہنے لگے۔ ماسٹر ابراہیم نے بے قرار ہو کر کہا۔

"آپ ایسا نہ کہیں عبدالعلی صاحب...... سارے راستے ہیں...... ہر راستے سے گزرنا ہوتا ہے انسان نے...... صرف سیدھے راستے سے چل کر کیسے پہنچے گا رب تک؟" وہ اُنہیں تسلی دے رہے تھے۔

"میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں اب...... کام کرتے ہوئے ہاتھ کانپتے ہیں میرے...... یہ کام میرے ساتھ ختم ہو جائے گا...... وہ خاندان جو اتنی نسلوں سے مسجدِ قرطبہ اور الحمرا میں خطاطی کرتے کرتے ترکی کی مسجدوں اور محلوں میں خطاطی کرتا آیا ہے، وہ میرے بعد محقق خطاطوں کا خاندان نہیں کہلائے گا...... میرے خاندان میں کوئی اللہ کا نام لکھنے والا نہیں رہے گا۔ یہ غم بہت بڑا ہے میرے لیے...... کی موت سے بھی بڑا......"

ماسٹر ابراہیم نے اُن کا کندھا تھپکتے ہوئے اُنہیں تسلی دی۔

"چائے بناتا ہوں آپ کے لیے لیکن آپ روئیں نہیں...... اُستاد کی آنکھوں میں آنسو برداشت نہیں ہوتے......"

عبدالعلی نے رومال سے اپنی آنکھیں رگڑیں۔

"بس دل بھر آیا۔"

"وہ کہیں نہیں جاتا...... ادھر ہی آئے گا...... میرے ماں باپ بھی بڑے پریشان ہوئے تھے۔ سیدوں کا بیٹا جوتے بنانے لگ گیا، وہ بھی عورتوں کے فیشن شوز...... ریمپ...... وہ کیا سرکل تھا جس میں اُٹھتا بیٹھتا تھا۔ نہ خاندان کی پروا تھی، نہ دین کی...... بس دُنیا کا ہی ہو کر رہ گیا تھا اور دیکھ لیں۔ اللہ نے کہاں سے کھینچ کر کہاں لا بٹھایا ہے مجھے...... میلان، پیرس، نیویارک...... کس کی نائٹ لائف روک سکی ہے مجھے۔" وہ ہنستے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"بس ایک وقت ہوتا ہے...... اور وقت سے پہلے کچھ نہیں ہوتا...... آپ دُعا کریں۔ اللہ قلبِ مومن کا وہ وقت پہلے لے آئے۔ آنا تو اِدھر ہی ہے اُس نے۔" وہ اُنہیں تسلی دیتے ہوئے گئے تھے اور عبدالعلی اُن کا چہرہ دیکھتے رہ گئے تھے۔

☆☆☆

سفید چادر پر اپنے ہاتھ سے گرنے والی گٹھلیوں کو وہ کسی میکانیکی انداز میں دیکھ رہی تھی۔ اپنے ایک گھٹنے کو سیدھا رکھے اور دوسرے پر اپنی تھوڑی ٹکائے وہ ایک بازو اسی گھٹنے کے گرد لپیٹے بیٹھی تھی۔ اُس کے گھر کے چھوٹے سے صحن میں بھی سفید چادر کے گرد عورتیں بیٹھی ہوئیں گپ شپ میں مصروف گٹھلیاں پھینکتی جا رہی تھیں۔ وہ آیتِ کریمہ کا آخری ورد تھا اور اُس کے بعد ختم دلوایا جاتا اور پھر کھانا بٹنا شروع ہوتا۔ آج جہانگیر کا سوئم تھا۔

سفید چادر کے درمیان گٹھلیوں کا ڈھیر غائب ہوتے ہی یک دم چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ محلے سے اب انہی عورتوں کے بچے بھی وہیں آنا شروع ہو گئے تھے۔ اُس کے برابر بیٹھی اقصیٰ نے چادر پر پڑے فون کی طرف

PakiBooks.Site

اُس کی توجہ مبذول کروائی جو بار بار تھرتھرا رہا تھا اُس پر کاسٹنگ ایجنٹ کا نام چمک رہا تھا۔ مومنہ نے فون کو نہیں چھوا۔ آنکھیں بند کر لیں۔

''اندر عورتوں کو بھی بھیج دو کھانا..... ارے شرفو! پانی کے دو جگ تو پکڑ..... اب وہ بھی کیا جھومر ہی لائے گا۔'' باہر گلی میں جھومر بلند آواز میں ختم کے بعد بول رہی تھی۔

جھومر باہر گلی سے پرات میں چاول ڈالے پھرتی سے بار بار اندر باہر آ جا رہا تھا۔ سفید چادر اب چاولوں کی پلیٹوں سے باہر گرنے والے دانوں سے بھر رہی تھی..... اُس میں بے شمار سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔ کچھ چھوٹے بچوں کے مٹی سے بھرے پیروں کے نشان بھی نظر آ رہے تھے اور جگہ جگہ گلاسوں سے چھلکنے والا پانی بھی۔ مومنہ سلطان کا گھر اس وقت شور سے گونج رہا تھا۔ رات میں بریانی کے اندر پڑی بوٹیوں کو چھیننے کے لیے ایک کھینچا تانی ہو رہی تھی۔ صرف مومنہ سلطان اور اقصیٰ تھیں جو چپ چاپ ایک طرف بیٹھی تھیں..... اور ثریا جو چادر کے دوسرے کنارے پر کچھ عورتوں کے بیچ بیٹھی تھی۔

''تو بھی کھانا کھا لے جھومر۔'' کسی نے گزرتے ہوئے جھومر سے کہا تھا۔

''جھومر شادی والے گھر سے کھاتی ہے، ماتم والے گھر سے نہیں..... بے شرم ہے جھومر، بے حس نہیں ہے۔'' وہ کہہ کر اُسی طرح گزر گئی تھی۔

''لونڈا دیکھو بیجڑے کا۔'' کسی اور نے تبصرہ کیا تھا اور عورتوں نے چاول کے نوالے منہ میں ڈالتے ہوئے قہقہہ لگایا۔

آدھ گھنٹے بعد وہاں کوئی نہیں رہ گیا۔ بس وہی تین لوگ اُس چادر پر بیٹھے ہوئے تھے اُسی طرح گم صم اور سفید چادر جو اب پوری طرح داغ دار اور برتنوں، ہڈیوں اور چاولوں سے اٹی ہوئی تھی۔

مومنہ نے اقصیٰ کے ساتھ مل کر وہ چادر اُٹھائی پھر صحن کی صفائی کی۔ سلطان اب بھی کہیں باہر تھا۔ ثریا اندر کمرے میں۔

''کل سے شوٹ ہے میری..... دو تین دن نہیں آپاؤں گی پھر چکر لگاؤں گی۔'' اقصیٰ نے داؤد کے آنے پر مومنہ سے کہا۔

''تم نے پہلے بھی بہت وقت دیا اب بھی.....''

اقصیٰ نے اُس کی بات کاٹی۔ ''اب شکریہ ادا مت کرنا..... یہ وقت نہیں ہے شکریہ کا۔''

''نہیں، شکریہ ادا نہیں کروں گی..... کروں بھی تو کس کس چیز کے لیے کروں۔'' مومنہ بڑبڑائی تھی۔ اقصیٰ نے بات بدل دی۔

''میں نکلتی ہوں پھر۔''

وہ اُس سے گلے ملی اور پھر باہر نکل گئی۔ جھومر کھلے دروازے سے اُسی وقت اندر آیا تھا اور اُس نے مومنہ کو کرسی اُٹھانے سے روکا۔

''چھوڑ دیں باجی! جھومر اُٹھاتی ہے..... آپ کا کام نہیں ہے۔'' اُس نے پھرتی سے اُس کے ہاتھ سے کرسی پکڑی۔

''بڑی مشکل میں کام آئے ہمارے..... کھانا لانا تمہاری ذمہ داری نہیں تھی جھومر۔'' مومنہ نے اُس سے کہا۔

''مجھے شرمندہ نہ کریں باجی..... مجھے بس ایک فکر تھی کھانا لاتے ہوئے۔''

''کیا؟'' مومنہ نے پوچھا۔ جھومر نے کچھ نادم انداز میں سر جھکا کر نظر ملائے بغیر کہا۔

''حرام کے پیسوں سے لائی تھی۔ قبول ہو جائے گی نا۔'' مومنہ اُس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی تھی پھر اُس نے مدھم

آواز میں کہا۔

"بہت ہمیں مجبور ۔۔۔" مجبور کرسی اٹھا کر مزید دیکھے بغیر گھر سے نکل گیا۔

مومنہ گن میں رُکے بغیر جہانگیر کے کمرے میں آئی۔ ثریا وہاں نہیں تھی۔ جہانگیر کا کمرہ ویسا ہی تھا، اس کا بستر ویسے ہی سلوٹ زدہ تھا۔ بستر کے سرہانے پڑی ہوئی دوائیوں کا ڈھیر بھی وہیں کا وہیں تھا۔ اس کے سارے ایوارڈز، فریمڈ تصاویر، اخباری تراشے۔ سب کچھ وہیں کا وہیں تھا۔ صرف وہ نہیں تھا۔

وہ سیدھا اس کے بستر پر گئی اور چت لیٹ گئی۔ اس کی چادر اس نے سر پر تان لی تھی۔ کسی نے اس کی چادر کھینچ کر کہا۔

"آپا ۔۔۔ آپا ۔۔۔"

وہ جھنجھلا کر بولی۔

"کیا ہے تمہیں، سونے بھی نہیں دیتے۔"

"میرے بستر پر کیوں سو رہی ہو؟" وہ خفا ہوا تھا۔

"سو رہی ہوں بس اور اب میرا دماغ مت کھانا ۔۔۔ گھنٹے بعد آنا ۔۔۔ بازار چلیں گے۔"

"جو چیز تمہارے پاس ہے ہی نہیں وہ کیسے کھاؤں گا میں، البتہ میرے پاس ہے دماغ ۔۔۔ جواب اماں، ابا اور تم نے چاٹ لیا ہے۔" جہانگیر نے جواباً کہا تھا۔

"جہانگیر! اب اگر میں اٹھی نا تو سیدھا چپل ماروں گی تمہیں۔"

مومنہ نے چادر اسی طرح تانے اس سے کہا تھا۔

"چپل تو میں پہلے ہی پھینک آیا باہر ۔۔۔ اتنا بے وقوف تو نہیں کہ چپل تمہارے پاس ہو تو میں پاس آؤں اور لمبی باتیں کروں۔" مومنہ تب تک غنودگی میں جا چکی تھی۔ کسی نے اس کی چادر کو زور سے کھینچا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ وہ ثریا تھی جو اس کی چادر کھینچ رہی تھی۔

"کیا ہوا اماں؟" مومنہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"ایسے مت لیٹ چادر لے کر۔" ثریا نے اتنے دنوں میں پہلی بار جہانگیر سے ہٹ کر کوئی جملہ کہا تھا اس سے اور پھر رُکے بغیر چلی گئی تھی۔ مومنہ اس خواب سے باہر آ گئی تھی جس میں جہانگیر بھی اس کے ساتھ تھا۔ فون پھر تھرتھرانے لگا تھا اور مومنہ سلطان اس دنیا سے بھاگنا چاہتی تھی جو اس فون کے ذریعے اس تک آنا چاہتی تھی۔ کسی آکٹوپس کی طرح اس کو اپنے شکنجے میں لینا چاہتی تھی۔

☆☆☆

قلب مومن کو نیند میں کسی آواز نے جگایا تھا۔ بستر پر لیٹے لیٹے آنکھیں کھولے وہ نیم تاریکی میں آواز کے ماخذ کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ رات کا پچھلا پہر تھا اور اس کے کمرے میں مکمل خاموشی تھی اور اس خاموشی میں ہلکے ہلکے وقفے سے جیسے کوئی سسکی ابھرتی پھر خاموشی چھا جاتی۔ غنودگی کے عالم میں وہ ان سسکیوں کو پہچاننے کی کوشش کرتا رہا اور پھر یک دم وہ پہچان گیا اور پہچاننے کے ساتھ ہی وہ جیسے کرنٹ کھا کر اٹھا تھا۔ وہ دادا کی آواز تھی۔

کمبل پھینکتے ہوئے بستر سے نکل کر ننگے پاؤں وہ اپنے کمرے سے نکلا تھا۔ تقریباً بھاگتے ہوئے اس نے دستک دیے بغیر دادا کے کمرے کا دروازہ کو ہلکا سا دھکا دیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ کمرے میں صرف ایک بیڈ سائیڈ ٹیبل لیمپ آن تھا اور اس زرد روشنی میں عبدالعلی کمرے کے فرش پر بچھے مصلے پر سر بسجود ہچکیوں سے رو رہے تھے۔ قلب مومن کا خیال تھا۔ ان کی طبیعت خراب تھی۔ مگر وہ ٹھیک تھے۔ صرف رو رہے تھے ۔۔۔ باآواز، ہچکیوں سے ۔۔۔ دیوار پر ٹنگے کلاک پر قلب مومن نے پہلی بار وقت دیکھا۔ وہاں پر تین بج کر پینتیس منٹ ہو رہے تھے۔ وہ

یقیناً تہجد پڑھنے کے لیے جاگے تھے اور اب تہجد پڑھنے کے دوران کسی بات پر روئے تھے۔ لمحے بھر کے لیے مومن کو خیال آیا وہ اسی خاموشی سے وہاں سے چلا جائے۔ وہ عبدالعلی اور اُن کے رب کا معاملہ تھا۔ وہ اس رازداری میں شریک ہونا نہیں چاہتا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہناتا۔ اُس نے دادا کی زبان پر اپنا نام سنا تھا۔ قلبِ مومن کو لگا اُس نے غلط سنا۔ دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے وہ اُنہیں دیکھتا رہا۔ وہ دوبارہ اُسی کا نام لے رہے تھے کچھ کہہ رہے تھے اور جو کچھ کہہ رہے تھے۔ قلبِ مومن نے سن لیا تھا۔

''اے اللہ! میرے مومن کو سیدھا راستہ دکھا۔ اُسے ہدایت دے۔'' وہ روتے ہوئے بار بار یہ جملہ ادا کر رہے تھے۔ قلبِ مومن دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے پہلے پانی ہوا تھا پھر آگ..... دادا پر ایسا غصہ سالوں بعد آیا تھا۔ وہ اللہ سے اُس کی شکایت کر رہے تھے، دُعا نہیں..... اُن کو کیا حق تھا یہ کرنے کا..... وہ وہیں کھڑا بے حد خفگی سے انہیں دیکھتا رہا..... بے حد خفگی سے..... پھر وہ پلٹ کر دیوار کے ساتھ پڑے اُس صوفہ پر بیٹھ گیا تھا جو دادا کی پشت پر تھا۔

''میرے مومن کو صراطِ مستقیم پر چلا..... اُن لوگوں کے راستے پر جن سے تو راضی ہوا نہ کہ اُن لوگوں کے راستے پر جن پر تیرا عذاب نازل ہوا۔'' وہ روتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

زمین پر سجدے میں اُن کا وجود لرز رہا تھا اور قلبِ مومن کا سینہ جیسے اُن کے الفاظ نے چیر دیا تھا۔ اُس کی انا پر کاری ضرب لگی تھی۔ دادا کو یہ حق نہیں تھا۔ وہ اُسے رات کے اس پہر اللہ کی عدالت میں کھڑا کر دیتے۔

اُن کے سجدے میں گڑگڑاتے وجود کو دیکھ کر صوفے پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھے قلبِ مومن کو سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی..... شراب کی..... یا کسی ڈرنک کی جو چند لمحوں کے اندر اُسے اس احساس سے مبرّا کر دیتی جس کا شکار وہ اس وقت ہو رہا تھا۔

عبدالعلی بڑی دیر گڑگڑاتے رہے تھے اور پھر اُٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔ انہوں نے اُس وقت کمرے میں قلبِ مومن کی موجودگی محسوس نہیں کی تھی۔ وہ دعا کر رہے تھے اور جب انہوں نے دعا ختم کی تو وہ قلبِ مومن کی بھاری آواز سے جیسے ہڑبڑا کر چونکے تھے۔

''دادا! آپ کے نزدیک سیدھا راستہ ہے کیا، جس پر میں نہیں ہوں؟''

اس کا لہجہ ٹھنڈا، آواز سنجیدہ تھی۔ عبدالعلی کچھ دیر وہیں چپ چاپ بیٹھے رہے پھر وہ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور تب انہوں نے قلبِ مومن کو پہلی بار دیکھا۔ وہ اب صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا تھا اور اُس نے اُن کے کھڑا ہونے پر صوفے کے ساتھ سائیڈ ٹیبل لیمپ کو آن کر دیا تھا۔ کمرے کی روشنی میں یک دم اضافہ ہوا۔

عبدالعلی نے اُس روشنی میں قلبِ مومن کا چہرہ دیکھا۔ وہ مومن نہیں طٰہٰ تھا اور اُن سے کہہ رہا تھا۔

''بابا..... آپ کے نزدیک سیدھا راستہ ہے کیا؟'' عبدالعلی بے اختیار آگے بڑھے تھے اور انہوں نے کسی معمول سحر زدہ انداز میں اُس کا چہرہ چھوتے ہوئے کہا۔

''طٰہٰ۔'' مومن نے حیرانی سے اپنے چہرے کو چھوا۔ اُن کا ہاتھ اور اُس کی انگلیاں دیکھیں اور پھر اُس نے عبدالعلی سے کہا۔

''دادا! میں قلبِ مومن ہوں۔'' عبدالعلی یک دم ہڑبڑائے یوں جیسے کسی طلسم سے باہر آئے تھے۔

''کیا ہوتا ہے سیدھا راستہ؟'' مومن نے دوبارہ اُن سے پوچھا تھا۔ وہ اُسے دیکھتے رہے پھر مدھم آواز میں بولے۔

''فلاح کا راستہ۔''

قلبِ مومن یک دم اُٹھ کر کھڑا ہوا۔ اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اُس نے پوچھا۔

''کیا ہوتی ہے فلاح؟ کامیابی نا؟ میں آپ کو دکھاتا ہوں۔ کیا ہوتی ہے فلاح..... کیا ہوتی ہے کامیابی۔''
اُس نے یک دم اُن کا ہاتھ پکڑا اور اُنہیں ساتھ لیے لاؤنج میں آ گیا۔
دیوار پر لگی اپنی ٹرافیوں اور ایوارڈز سے بھرے ریکس کے سامنے کھڑے ہو کر اُس نے دادا سے کہا۔ ''یہ ہے فلاح۔'' پھر وہ سینٹر ٹیبل پر پڑے اُن میگزینز اور نیوز پیپرز کو باری باری انہیں دکھاتے ہوئے پھینکنے لگا۔ ''یہ ہے فلاح دادا۔'' آخری میگزین ٹیبل پر واپس پھینکتے ہوئے اُس نے دادا سے کہا۔
''یہ گھر دیکھ رہے ہیں..... گلاس پینٹ ہاؤس..... شہر کا مہنگا ترین علاقہ ہے یہ..... چند سالوں میں بنایا ہے میں نے..... چند سالوں میں..... یہ پورا ملک مجھے جانتا اور پہچانتا ہے..... ایکٹرز، ایکٹریسز میرے ساتھ کام کرنے کے لیے منتیں کرتی ہیں..... برانڈز میرے ایک اشارے پر آنکھیں بند کر کے میرے پراجیکٹس پر پیسہ پھینک دیتے ہیں..... یہ فلاح ہے..... یہ سیدھا راستہ ہے۔''
وہ دیوار پر لگے سپر اسٹارز کے ساتھ فریم تصویروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ یوں جیسے اُس پر پاگل پن کا دورہ پڑا تھا اور دادا وہاں کھڑے یوں اُسے دیکھ رہے تھے جیسے سرکس میں مداری اُس سدھائے ہوئے جانور کو دیکھ رہا ہو جو یک دم ہتھے سے اُکھڑ گیا ہو۔
''جو تم کر رہے ہو..... وہ بے حیائی ہے..... بے حیائی میں سب ملتا ہے..... سب..... ایسے ہی گھر..... وہی گاڑیاں جو تم چلاتے ہو۔'' وہ مدھم آواز میں کوڑے برسا رہے تھے۔ ٹھنڈی، میٹھی آواز قلبِ مومن کے نظریہ کامیابی کے پرخچے اُڑا رہی تھی۔
''وہ برانڈز جو تم پر پیسہ لگا رہے ہیں۔ وہ تم پر پیسہ نہیں لگا رہے۔ اُس بے حیائی پر لگا رہے ہیں جسے تم پروموٹ کرتے ہو..... تم جسم دکھاتے ہو اور جسم کی پرستش کرواتے ہو..... دُنیا تمہارا طواف کیوں نہ کرے مومن..... کیوں نہ سر پر بٹھائے تمہیں۔''
قلبِ مومن کا چہرہ کس رنگ کا ہوا تھا وہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا..... سرخ..... زرد..... سفید..... وہ جو بھی رنگت تھی۔ نارمل رنگت نہیں رہی تھی۔
''آپ بہت زیادتی کر رہے ہیں دادا..... میرے کام کو حقیر اور چھوٹا کہہ کر..... آپ دراصل مجھ سے حسد کرتے ہیں..... آپ نے آخر کیا کمایا کیلی گرافی کو اپنی زندگی کے ستر سال دے کر..... میں آپ سے آدھی عمر کا بھی نہیں ہوں مگر میری کامیابی کا اسکیل دیکھیں۔ دُنیا کی ہر آسائش ہے میرے پاس..... ناموری ہے..... لاکھوں کروڑوں لوگ فین ہیں میرے۔ جان قربان کرنے والے دوست ہیں..... آپ کے پاس کیا ہے؟''
وہ بدتمیزی کی حد تک صاف گوئی پر اُترا ہوا تھا۔ وہ اپنا رُخ اور رنگ دکھا رہا تھا عبدالعلی کو جو اس سے پہلے صرف دنیا نے دیکھا تھا۔
''میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ تم یہی سننا چاہتے ہو نا مجھ سے؟ میرے پاس تمہاری طرح کریڈٹ کارڈز سے بھرا ہوا والٹ نہیں ہے۔ یہ اسمارٹ فون بھی نہیں ہے جو تمہارے پاس ہے۔ دُنیاوی اثاثے صفر ہیں..... کروڑوں لوگوں کی چاہت بھی نہیں ہے میرے پاس..... نہ مجھے تمہاری دُنیا کے نامور لوگ جانتے ہیں مگر قلبِ مومن! مجھے اللہ جانتا اور پہچانتا ہے..... کیا تمہیں جاننا ہے اللہ۔'' قلبِ مومن کو بت بنا دیا تھا انہوں نے آگ کے گولے سے..... وہ ساکت کھڑا اُن کا چہرہ دیکھتا رہا پھر اُس نے کہا۔
''یہ آپ کا غرور ہے۔''
''یہ میرا ایمان ہے۔'' انہوں نے جواباً کہا۔
''سولہ سولہ گھنٹے اللہ کا نام لکھوں اور یہ خوش گمانی بھی نہ رکھوں کہ وہ مجھے پہچانتا ہے..... تم کو غرور لگتا ہے،

غرور ہی تھی۔" انہوں نے جیسے اُسے چیلنج کرتے ہوئے یہ کہا تھا۔

"پھر آپ سے بات نہیں کر سکتا۔ آپ واپس چلے جائیں۔ میں اپنی زندگی، اپنی دنیا سے خوش ہوں میں کبھی آپ کی دنیا میں نہیں آؤں گا۔" وہ بڑی تلخی سے کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا تھا۔

عبدالعلی کمرے سے رہ گئے تھے۔ انہیں طہٰ یاد آیا تھا۔ اس نے بھی ایک بار ایسے ہی ضد کی تھی ان سے ایک ہی بار اور ایسے ہی پلٹ کر گیا تھا پھر دوبارہ نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

برآمدے میں پڑا سلطان کا وینٹی باکس زندگی میں پہلی بار گرد آلود دیکھا تھا مومنہ نے۔ اُس نے دوپٹے کے پلے سے اُس مٹی کو پونچھنے کی کوشش کی پھر اُسے اُٹھا کر اندر کمرے میں لے آئی۔ سلطان اپنے بستر میں منہ سر لپیٹے پڑا تھا۔

"ابا...... ابا......" اُس کے پاس کھڑے ہو کر وینٹی باکس ہاتھ میں لیے مومنہ نے اُسے پکارا تھا۔ سلطان نے چادر ہٹا کر اُسے دیکھا۔ اُس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ بال بے ہنگم۔ آنکھیں سرخ۔ وہ مٹی جو اُس وینٹی باکس پر پڑی ہوئی تھی، مومنہ کو اپنے باپ کے چہرے پر بھی دکھی...... وہ دنوں میں بوڑھا ہوا تھا۔

"آپ کا وینٹی باکس لائی ہوں۔" اُس نے لہجہ حتی الامکان نارمل رکھتے ہوئے کہا۔ وہ اب گھر کے باقی دونوں وجودوں کو جیسے فرسٹ ایڈ دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ سلطان نے اُس کے ہاتھ سے وینٹی باکس چپ چاپ لے لیا۔

"مٹی پڑی ہوئی تھی ابا۔" مومنہ نے جیسے اُس سے باتیں کرنے کی کوشش کی۔

"مٹی تو پتا نہیں کس کس چیز پر پڑ گئی ہے۔" وہ بڑبڑایا تھا اور اُس کی بڑبڑاہٹ نے مومنہ کو چپ کرا دیا۔

"اتنے دن ہو گئے، آپ نے حسنِ جہاں کی بات نہیں کی۔" اُس کو یک دم وہ موضوع یاد آیا جس پر وہ باپ سے بات کر سکتی تھی۔

"حسنِ جہاں۔" وہ بڑبڑایا۔

"حسنِ جہاں بھی تو مر گئی تھی۔" وہ یک دم کہہ کر رونے لگا، مومنہ کی ساری کوششوں پر پانی پھیرتے ہوئے۔ وہ وہاں رُک نہیں پائی۔ باپ کو اس طرح روتے دیکھنا بڑا مشکل کام تھا۔

باہر برآمدے میں ثریا اپنے کندھے کو ہاتھ سے دباتی، تھکی ہوئی چلی آ رہی تھی۔

"کندھے کو کیا ہوا اماں؟" مومنہ کو تشویش ہوئی۔

"دُکھ رہا ہے۔" ثریا نے کہا۔

"میں دبا دوں، ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں؟" مومنہ نے اُس کے کندھے کو ہلکا سا دباتے ہوئے کہا۔

"نہیں، خود ٹھیک ہو جائے گا...... یہ ٹھیک ہو جائے گا تو کچھ اور دُکھنا شروع ہو جائے گا۔ کس کس چیز کو دبواتی پھروں......" اُس نے عجیب سی بے زاری سے کہا پھر اُسی سانس میں اُس سے پھر مخاطب ہوئی۔

"میں سوچ رہی تھی تم امریکہ نہ جاؤ۔" اُس کا اشارہ فلم کی طرف تھا۔

"کیوں اماں؟" اُس نے پوچھا۔

"بس دل گھبراتا ہے۔"

"ایک مہینے کی تو بات ہے۔" مومنہ نے تسلی دی۔ "وہ فلم رہنے دیتیں...... اب تو ضرورت بھی نہیں...... دال، روٹی تو ٹی وی سے بھی چل جاتی۔" اُس نے مدھم آواز میں کہا۔

"قرضہ ہے سر پر اماں۔" مومنہ نے جیسے اُسے یاد دلایا۔

"ہاں...... پر...... پتا نہیں...... کوئی کام ڈھونڈتی ہوں میں...... جہانگیر کے ابا سے کہتی ہوں میں۔" اُس

نے گڑبڑائے ہوئے انداز میں کہا اور پھر یک دم پیچھے اندر سے سلطان کے رونے کی آواز آئی۔
"ان کو کیا ہوا؟" وہ پریشان ہوئی۔
"ایک ہی تو بہن ہے اماں۔" مومنہ نے مدھم آواز میں کہا۔
ثریا نے اُس کا چہرہ دیکھا پھر پانی اُس کی آنکھوں میں اُمڈا۔ دوپٹے سے چہرہ اچھالتے ہوئے اُس نے کہا۔
"میں دیکھوں ذرا۔" وہ کہہ کر اندر چلی گئی تھی۔ مومنہ وہیں کھڑی رہی۔
"پتا نہیں میں اتنی بے حس کیسے ہوگئی ہوں۔ میرے حصے کے آنسو بھی اماں اور ابا ہی بہائیں گے۔" باہر صحن میں پڑے اُس کے فون نے جیسے اُس کو چونکایا۔
"یار! فون تو اٹینڈ کرلو اُس ایجنٹ کا..... داؤد کو پریشان کرنا شروع کردیا ہے اُس نے کال کر کر کے۔" فون پر اقصیٰ تھی اور اُس نے اُس کی آواز سنتے ہی کہا تھا۔
"ہاں بس لے رہی ہوں کال۔" اُس نے اقصیٰ کو ٹالا۔
"پاسپورٹ چاہیے اُنہیں تمہارا فوراً..... ویزہ اپلائی کرنا ہے۔" اقصیٰ نے اُس سے کہا۔
"وہ بنوانا ہے ابھی۔" مومنہ نے جواباً کہا۔
"کل چلو میرے ساتھ یہ کام تو نپٹاتے ہیں۔" اقصیٰ نے حل پیش کیا پھر یک دم کہا۔ "تم فلم چھوڑنے کا تو نہیں سوچ رہیں نا؟"
"یہ آپشن نہیں ہے میرے پاس، چاہوں بھی تو..... ایڈوانس کی رقم استعمال ہوگئی ہے۔" مومنہ نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔
"ایسے مت کہو یار..... لائف ٹائم اپر چونٹی (موقع) ہے..... تمہیں یاد ہے کتنی خواہش تھی تمہاری کہ یہ فلم تمہیں مل جائے۔" اقصیٰ نے جیسے اُسے جوش دلانے کی کوشش کی۔
"جہانگیر وجہ تھی "تب"۔" اُس نے مدھم آواز میں کہا۔
"تمہیں کیا ہوگیا ہے مومنہ؟" اقصیٰ نے تشویش سے کہا تھا۔
"میں سو نہیں پارہی..... دل چاہتا ہے کئی دن کے لیے سو جاؤں مگر جب سونے کے لیے لیٹتی ہوں تو اُن سب کے چہرے آنکھوں کے سامنے آنے شروع ہوجاتے ہیں جن سے قرض لیا ہے۔" اُس نے بالآخر جیسے اُس سے دل کی بات شیئر کی۔
"اس گلی کے ہر گھر سے قرض لے رکھا ہے ہم نے..... کچھ پہلے لیا تھا..... کچھ اب..... اور پھر جہانگیر کو ہاسپٹل سے لانے کے لیے..... وہ جو کہتے ہیں نا بال بال قرض میں جکڑا ہوا ہے۔ مجھے آج پتا چلا ہے وہ کیسے ہوتا ہے۔" وہ دل گرفتگی سے کہہ رہی تھی۔
"دماغ پر مت سوار کرو یہ سب کچھ..... اُتر جائے گا سارا قرض..... کون سا ابھی کوئی مانگ رہا ہے۔" اقصیٰ نے تسلی دی۔
"مانگ رہے ہیں..... یہ غریبوں کا محلہ ہے اقصیٰ! ان سب کو ضرورت ہے اپنے پیسوں کی..... ابھی ہمدردی میں نرمی سے تقاضا کررہے ہیں اور پھر سختی سے کریں گے۔" مومنہ نے کہا۔
"تم اتنی حساس مت ہو مومنہ! دل کو..... غبار نکالو اپنے اندر سے۔" وہ اسے اس کے علاوہ اور کوئی حل پیش نہیں کرسکی تھی۔ جانتی تھی مومنہ ٹھیک کہہ رہی۔
"مجھے رونا نہیں آتا اقصیٰ..... میرے گھر میں دو لوگ پہلے ہی دن رات روتے ہیں..... میں کیسے روؤں..... میرے سامنے ضرورتوں کا پہاڑ کھڑا ہے اور میرے ہاتھ پیر کام نہیں کررہے..... اس کو سر کروں تو

کیسے کروں۔" وہ اُس سے کہہ رہی تھی۔ صرف اُسی سے یہ سب کہہ سکتی تھی۔

"یہ قلم کر لو مومنہ! بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے۔" انھوں نے اُسے جواباً کہا۔ وہ چپ چاپ اُس کی باتیں سنتی رہی۔

☆☆☆

وہ رات دیر سے گھر آیا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ دادا سو چکے ہوں گے۔ شکور نے دروازہ کھولا۔

"کھانا دے دو مجھے۔" وہ اتفاقاً اُس رات کھانا نہیں کھا سکا تھا ورنہ اتنی رات کو ہمیشہ کھانا کھا کر گھر آتا تھا۔

"ہاہ...... آپ کھانا کھائیں گے...... وہ تو میں نے بنایا ہی نہیں۔" شکور نے بے اختیار منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"کیوں دادا کو نہیں دیا؟" مومن نے پوچھا تھا۔

"دادا تو چلے گئے۔" شکور نے اُسی سانس میں کہا۔ مومن اندر جاتے جاتے ٹھٹھک گیا۔

"کیا مطلب کہاں چلے گئے؟"

"واپس ترکی...... اُن کی فلائٹ تھی آج...... آپ کو یہ بھی نہیں پتا؟" شکور نے اُس کے چہرے سے ہی اندازہ لگایا۔

"تم نے مجھے نہیں بتایا۔" مومن کو اس کے سوا کوئی جواب نہیں سوجھ پایا تھا۔ ایک عجیب سی پشیمانی نے اُسے آن گھیرا تھا۔

"مجھے لگا، آپ کو خود پتا ہو گا۔ مجھے کہا ٹیکسی منگوا دو...... میں نے فٹ سے کریم منگوائی ایپ ڈاؤن لوڈ کر رکھی تھی۔ کرولا پر بھیجا ہے دادا جی کو۔" شکور نے فخریہ مومن کو بتایا۔ مومن کھڑا اُسے دیکھتا رہا پھر کچھ کہے بغیر اپنے کمرے کی طرف مڑ گیا۔

"اب بھی کھانا کھائیں گے؟" شکور نے پیچھے سے آواز دی۔

"نہیں۔" مومن نے کہا۔

"شکر ہے کھانے کے چکر میں شور ہو جانا تھا میرا۔" شکور کے سر سے جیسے بلا ٹلی تھی۔

☆☆☆

وہ اپنے کمرے میں جا کر بیٹھا رہا پھر اُٹھ کر دادا کے کمرے میں آ گیا۔ دروازہ بند کر کے اُس نے لائٹ آن کی۔ کمرہ یک دم روشن ہوا۔ وہاں ایک عجیب سا سکون تھا۔ فرش پر وہ مصلیٰ ویسے ہی بچھا ہوا تھا بس اُس کا ایک کونہ مڑا ہوا تھا۔ اُس کی سالگرہ پر دی جانے والی کیلی گرافی دیوار پر لگی ہوئی تھی۔

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْن۔

وہ پچھلے چھ سالوں سے ہر سالگرہ پر اُسے کوئی نہ کوئی آیت خطاطی کر کے دے رہے تھے۔ وہ انہیں ایک نظر دیکھ کر رکھ دیتا تھا۔ سوائے اُس پہلی کیلی گرافی کے جو اُس نے لاؤنج میں لگا رکھی تھی۔ بہت دیر وہاں کھڑا وہ اُس آیت کو دیکھتا رہا پھر اُس کی آنکھوں کے سامنے وہی سین چلنے لگا تھا۔ رات کے اُس پچھلے پہر دادا کا اُس مصلے پر سجدے میں رونا۔

"اے اللہ! میرے مومن کو سیدھا راستہ دکھا...... اسے صراطِ مستقیم پر چلا۔"

قلبِ مومن دیوار پر لگے اُس فریم کے سامنے سے ہٹا یوں جیسے یہ سب وہ سر سے جھٹک دینا چاہتا تھا۔ کان بند کر لینا چاہتا تھا۔ مگر اس کمرے میں آتے ہی دادا کی ساری باتیں گونج بن کر اُس کے گرد پھرنے لگی تھیں۔

"تم خوش ہو؟"

"بہت بہت زیادہ...... بے تحاشا۔"

"جگتے کیوں نہیں۔"
قلب مومن نے لائٹ آف کر دی۔ وہ اس آواز کی بازگشت سے فرار چاہتا تھا۔

☆☆☆

وہ اُس رات ٹھیک سے سو نہیں سکا۔ وہ زندگی میں پہلی بار اُس سے ناراض ہو کر گئے تھے یا شاید پہلی بار اُس نے اُن سے اتنے سخت لفظ بولے تھے۔

ناشتہ کی میز پر بھی اُس کا دھیان بار بار اُن کی طرف جاتا رہا۔ وہ اخبار دیکھ رہا تھا اور شکور اسٹور روم سے وہ سارے مجسمے نکال نکال کر دوبارہ لاؤنج میں اُنہیں ان کی جگہوں پر رکھتے ہوئے جھاڑ پونچھ کر رہا تھا۔

"دادا جی تھے تو صفائی کا کام کتنا کم ہو گیا تھا۔ ساری چیزیں اسٹور میں پڑی رہتی تھیں۔ اب پھر جھاڑ پونچھ ہو گی۔" شکور ایک مجسمہ کنسول پر رکھتے ہوئے کچھ بے زاری سے بڑبڑایا اور پھر اسی بڑبڑاہٹ میں مومن نے اُسے کہتے سنا۔

"پتا نہیں کیا پڑھ پڑھ کر پھونکتے رہتے تھے۔"
مومن متوجہ ہوا۔ "کون؟"

"دادا جی...... کونوں دیواروں میں...... اور آپ پر بھی تو پھونکتے تھے۔" شکور نے فوراً بتایا۔
"مجھ پر؟" مومن چونکا۔

"ہاں...... دو بار تو میں نے خود اُنہیں دیکھا...... آپ کو جگانے جاتے تھے اور جگائے بغیر آجاتے تھے۔ دادا جی بڑا پیار کرتے تھے آپ سے...... مومن ہیں بالکل...... مطلب اصلی والے...... آپ کا تو صرف نام ہے۔" شکور نے روانی میں جو کہا تھا۔ اُسے شاید خود بھی اپنے جملے کی گہرائی اور اثر کا اندازہ نہیں تھا مگر مومن کو اُس کے آخری جملے نے جیسے کچھ چبھویا تھا مگر شکور سے وہ کیا بحث کرتا۔

"تم سے میرے بارے میں کچھ پوچھتے تھے؟"
"کیا؟" مومن کے سوال پر شکور چونکا۔
"کچھ بھی؟" مومن خود بھی نہیں جان پایا وہ کس چیز کے بارے میں دریافت کرنا چاہتا تھا۔
"ہاں، پوچھتے تھے کہ آپ کب آئیں گے جب آپ رات کو لیٹ ہوتے تھے تو۔" شکور نے روانی سے کہا۔ مومن کو جیسے تسلی نہیں ہوئی۔

"کسی اور چیز کی بات کر رہا ہوں میں...... میرے بارے میں کچھ اور پوچھتے تھے؟ لڑکیوں سے دوستی وغیرہ کے بارے میں؟ یا میرے دوستوں کے بارے میں؟" مومن نے بالآخر کھل کر کہا۔

"نہیں جی۔ دادا جی کو تو سوال کرنے کی عادت ہی نہیں تھی...... یہ سب سے اچھی عادت ہے اُن کی...... بس میری ہی باتیں سنتے رہتے تھے ہر وقت اور آپ کو تو پتا ہے میں آپ کے بارے میں بھی بات ہی نہیں کرتا۔" شکور نے بے حد محتاط انداز میں اُس سے کہا تھا، وہ اُس کے سوالوں سے کچھ ڈرا تھا۔

مومن نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ چپ چاپ چائے کے اُس کپ کو دیکھتا رہا جس میں وہ چائے پی رہا تھا اور جو ابھی آدھا بھرا ہوا تھا۔ پھر وہ اُسی طرح اُٹھ کر چلا گیا۔ اُسے جاتے دیکھ کر شکور نے معنی خیز انداز میں تبصرہ کیا۔

"لگتا ہے، پچھتا رہے ہیں۔"

☆☆☆

"ہیلو ٹینا!" نیہا اُس وقت صوفی کے ساتھ اُس کی گاڑی میں تھی جب صوفی کے فون پر ٹینا کا نام چمکا تھا۔
"ہائے صوفی...... آپ کا انویٹیشن کارڈ تھا میرے پاس...... قلب مومن کی اگلی فلم کی اناؤنسمنٹ کی

تقریب ہے۔" ضوفی نے دھڑکتے دل کے ساتھ ٹینا کو اسپیکر پر لیا تاکہ نیہا بھی اُس کی بات سن سکے۔
"اچھا تو کاسٹ فائنل ہو گئی؟ کیا کاسٹ ہے؟" ضوفی نے لہجہ بے حد نارمل رکھتے ہوئے پوچھا۔
"آپ کے لیے سرپرائز ہے۔ مومن خود ہی آپ سے بات کریں گے لیکن آپ کا آنا لازمی ہے۔" ٹینا نے ہنستے ہوئے کہا۔ ضوفی نے بے یقینی سے نیہا کو دیکھا۔ اُس نے مرکا ہوا ایس جوش میں لہرایا تھا۔
"شیور...... شیور۔ آپ واٹس ایپ بھی کر دیں آئی ول بی دیئر۔"
"میں ابھی کر رہی ہوں۔ کنفرم کر کے اوکے کر دیں۔" ٹینا نے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔
"موہ مائی گاڈ۔ اس نے مجھے شامل کیا ہے۔"
اُس نے بے اختیار نیہا سے کہا تھا۔
"میں نے کیا کہا تھا تم سے۔" نیہا نے فخریہ انداز میں اُس سے کہا۔ "وہ مجھے انکار نہیں کر سکتا۔" وہ ہنس رہی تھی۔ "میں بہت ایکسائٹڈ ہو رہی ہوں۔ تم اسٹار بننے جا رہے ہو۔ تمہاری وارڈروب میں کروں گی۔" نیہا نے اُسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔
"بالکل مائی لو۔ یہ سب تمہاری ہی وجہ سے ہے۔ اپنا پہلا ایوارڈ تمہارے نام کروں گا میں۔" ضوفی نے بھی جواباً اُس کے گال پر بوسہ ثبت کیا تھا۔
"اور دوسرا؟" نیہا نے بڑے ناز سے پوچھا۔ "دوسرا تیسرا...... سارے۔" ضوفی نے ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔
"اب ٹینا مجھے کال کر رہی ہے انوائٹ کرنے کے لیے...... اور مجھے اتنے دنوں سے ٹینشن تھی کہ پتا نہیں کیا ہوگا کہیں بغیر مجھے انوائٹ کیے ہی اناؤنسمنٹ نہ ہو جائے۔"
اُس نے ضوفی سے بات کرتے ہوئے ٹینا کی کال لی تھی اور بڑے میٹھے لہجے میں اُس سے کہا تھا۔ "ہائے ٹینا۔"

٭٭٭

قب مومن کہیں جانے کے لیے اپنے بیڈروم میں تیار ہو رہا تھا۔ جب اُس کا سیل فون بجا۔ نیہا کا نام دیکھ کر اُس نے کال ریسیو کی۔ "ہیلو۔"
اُس کی 'ہیلو' کا جواب نیہا نے بے حد رومانٹک انداز میں دیا۔
"آئی لو یو جانو!" وہ جواباً مسکرایا۔
"آئی لو یو ٹو۔"
"یو آر دا بیسٹ۔" نیہا نے اپنی آواز کو مزید میٹھا کرتے ہوئے کہا۔
"یس آئی نو۔" مومن نے جواباً اُسی انداز میں کہا تھا۔ نیہا ہنسی۔
"مجھے پتا تھا تم میرے لیے کچھ بھی کر سکتے ہو۔"
"تمہاری ایکسپکٹیشن پر پورا اترنا میرے لیے اعزاز ہے۔" مومن نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"اوہ مومن! آئی لو یو۔" نیہا نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔
"تم آ رہی ہو نا کل؟" مومن نے اس بار موضوع بدلا۔
"ظاہر ہے اپنی جان کا ایونٹ کیسے مس کر سکتی ہوں۔"
"کون جان؟" مومن نے عجیب معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
"تم...... اور کون؟" نیہا نے اُس کے انداز کو مذاق سمجھا۔
"تمہارے بغیر تو یہ ایونٹ ہو ہی نہیں سکتا نیہا نہ تمہارے بغیر نہ ضوفی کے بغیر۔" مومن کچھ سنجیدہ ہوا تھا۔
"مجھے پتا ہے سرپرائز دینا چاہتے ہو مگر...... آئی لو سرپرائز۔ ضوفی تمہیں مایوس نہیں کرے گا۔"

PakiBooks.Site

''اور میں تم دونوں کو مایوس نہیں کروں گا۔'' مومن نے جواباً کہا۔
''ملتے ہیں؟'' نیہا نے اس بار بڑے رومانٹک انداز میں اُس سے کہا۔ ''اتنے دن ہو گئے، تم کو مس کر رہی ہوں۔''
مومن نے جواباً اُسی انداز میں کہا۔ ''کل ہی مل لیتے ہیں۔ آج میں کہیں جا رہا ہوں۔''
نیہا چونکی۔ ''کہاں؟''
''ایک نئی گرل فرینڈ کے ساتھ۔''
نیہا نے قہقہہ لگایا۔ ''ہو ہی نہیں سکتا۔''
''مومن پر اتنا اعتماد اچھا نہیں۔'' مومن نے عجیب سے لہجے میں کہا تھا۔
''اعتماد نہیں پیار ہے۔'' اُس نے بہت لاڈ سے کہا۔
''وہ بھی ناقابل اعتبار ہے۔''
''اچھا آج جو چاہے کہہ لو۔ سب معاف ہے تمہیں۔ تم نے اتنی بڑی خوش خبری دی ہے مجھے۔''
نیہا نے اُس سے کہا تھا۔
''کل اس سے بھی بڑی دوں گا۔ بائے۔''
یہ پہلی بار تھا کہ فون مومن نے رکھا تھا اس طرح بات کرتے ہوئے۔ نیہا کو کچھ کھٹکا تھا۔ ناراض ہے۔ میں منالوں گی۔ اب اتنا نخرا تو بنتا ہے اُس کا۔ اُس نے مطمئن انداز میں سوچا تھا۔ وہ مومن کو اچھی طرح جانتی تھی اور یہی اُس کی سب سے بڑی غلط فہمی تھی۔

☆☆☆

رات کی تاریکی میں ترکی کے اُس علاقے میں آس پاس کے گھنے سبزے کے درمیان وہ چھوٹا سا بے حد پرانا لکڑی کا دو منزلہ گھر کسی جگنو کی طرح چمک رہا تھا۔ وہ اُس علاقے کے سب سے پرانے گھروں میں سے ایک تھا۔
عبدالعلی اُس رات کینوس پر ایک نئی آیت پینٹ کرنے والے تھے اور اس وقت وہ وضو کر رہے تھے بے حد ٹھہر ٹھہر کر۔ یہ بھی اُن کی ایک روٹین تھی۔ وہ خطاطی ہمیشہ باوضو حالت میں کرتے تھے۔ فون کی پہلی گھنٹی پر انہیں جیسے پتا چل گیا تھا۔ فون کرنے والا کون تھا۔
''السلام علیکم۔'' قلب مومن کے لہجے میں عجیب سی ندامت تھی۔
''وعلیکم السلام۔'' عبدالعلی نے بے حد محبت سے کہا۔
''میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا۔''
''بالکل بھی نہیں۔ کیسے ہو تم؟'' انہوں نے مومن سے پوچھا۔
''ویسے کا ویسا ہوں یعنی بُرا..... آپ کیسے ہیں؟'' اُس نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔
''الحمدللہ۔'' عبدالعلی نے اُس کے جملے پر تبصرہ نہیں کیا۔
''آپ ناراض تو نہیں؟'' مومن نے فوراً ہی پوچھ لیا تھا۔
''نہیں۔'' عبدالعلی مسکرائے۔
''جانے سے پہلے مل کر نہیں گئے۔'' مومن نے گلہ کیا۔
''تم مصروف تھے۔''
''آپ کے لیے تو نہیں تھا۔ مجھے لگا، آپ ناراض ہو کر گئے ہیں۔'' وہ مدھم آواز میں کمرے میں ٹہلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
''ناراض ہو کر کیوں جاتا۔'' عبدالعلی کا لہجہ ویسا ہی ملائم تھا۔

''میرا اور آپ کا آرگومنٹ ہوا تھا..... شاید میں نے کچھ ایسا بھی کہہ دیا تھا جو میرا مطلب نہیں تھا..... اس لیے بس..... بعد میں سوچا تو..... سوری۔'' قلبِ مومن اٹکتے ہوئے وضاحت کر رہا تھا۔ ساری زندگی اُس نے بھی کسی سے معذرت تو درکنار اپنے رویے کی وضاحت بھی نہیں کی تھی تو اٹکتا نہ تو کیا کرتا۔

''مجھے خوشی ہے، آپ ناراض نہیں ہیں۔'' اُس نے جیسے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا تھا۔

''تم نے ایسی کوئی بات نہیں کی کہ مجھے غصہ آتا۔ غصہ دلانے والی ساری باتیں تو میں نے کی تھیں۔'' عبدالعلی اپنے کمرے میں ایزل اور کینوس رکھتے ہوئے ساتھ اُس سے بات بھی کر رہے تھے۔

''یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں..... باتیں تو ساری غصہ دلانے والی ہی ہیں آپ کی..... اور زندگی میں پہلی بار کی ہیں آپ نے ایسی باتیں۔'' مومن نے فوراً ہی اتفاق کیا۔

''پھر تم نے سوچا اُن باتوں کے بارے میں؟'' انہوں نے پوچھا تھا۔

''بالکل بھی نہیں..... سوچنے والی کوئی بات تھی ہی نہیں اُن میں..... دادا! میں کوئی غلط کام نہیں کر رہا۔'' میں اپنی لائف پر، اپنے کام پر، اپنی اچیومنٹس پر بہت پراؤڈ فیل کرتا ہوں۔'' وہ یک دم سنجیدہ ہوا۔

''کام غلط نہیں ہے۔ سمت غلط ہے۔'' اُس نے عبدالعلی کو بات مکمل کرنے نہیں دی۔

''دادا! میں آپ سے کہوں، آپ اپنا کام چھوڑ دیں..... آپ چھوڑ دیں گے؟ میں آپ سے کہوں آپ کا کام غلط ہے۔ آپ مانیں گے؟ میرا اور آپ کا نظریاتی اختلاف ہے دادا۔ آپ زندگی کے بارے میں میرا نظریہ نہیں بدل سکتے۔'' وہ کہہ رہا تھا دوٹوک انداز میں۔

''میں نہیں بدل سکتا مومن..... اللہ تو بدل سکتا ہے۔'' انہوں نے مدھم آواز میں کہہ کر جیسے اُس کی طنابیں کھینچی تھیں۔

''آپ مجھے پریشان کر رہے ہیں دادا.....'' وہ زچ ہوا، اُکھڑا، خفگی کے عالم میں اُس نے فون بند کر دیا تھا۔ عبدالعلی ایسے نہیں تھے جیسے اب ہو رہے تھے۔

''دادا کو کیا ہو گیا ہے.....'' اُس نے پریشانی سے سوچا تھا۔ مگر وہ اُن کی کسی بات پر غور نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''انسان عمر کے اس حصے میں آ کر ایسا ہی ہو جاتا ہے..... مذہب، مذہب، نصیحتیں، نصیحتیں۔'' اپنی آستینوں کے بٹن کھولتے ہوئے اُس نے اُس بے قراری سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے جیسے خود سے کہا۔ جو دادا کے کچھ جملوں نے اُسے دی تھی۔

☆☆☆

''ماسٹر صاحب! میں ایک بات سوچ رہا ہوں۔'' اُس نوجوان لڑکے نے وہ ڈبہ کھولتے ہوئے ماسٹر ابراہیم سے کہا۔ وہ اُن کے پاس آنے والے بہت سے لڑکے لڑکیوں میں سے تھا۔

''کیا؟'' برآمدے میں بیٹھے اپنے کام میں مصروف ماسٹر ابراہیم نے کہا۔

''اگر یہ کام ہم نہ کر رہے ہوتے تو کیا ہوتا؟''

''تو پھر کوئی اور ہماری جگہ بیٹھا ہوتا یہ کام کرنے کے لیے..... اللہ کا کام ہے اور اللہ کے پاس اپنے کام کروانے کے لیے بندے بہت.....'' انہوں نے مسکراتے ہوئے اُسے دیکھے بغیر کہا۔

''یہ تو ٹھیک کہا آپ نے.....'' اُس لڑکے نے بے اختیار تائید کی۔ ''لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگوں کو پتا کیسے چلتا ہے اس جگہ کا اور آپ کا؟ کہاں کہاں سے پرانے اور بوسیدہ قرآن پاک کے نسخے آ رہے ہیں۔ آج جو ڈبہ آیا ہے، وہ چارسدہ سے آیا ہے۔'' وہ اس کارٹن پر لگے ایڈریس کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا جسے اُس نے ابھی کھولا تھا۔

''اللہ خبر دیتا ہے..... اب لا کر بٹھایا ہے اس کام کے لیے تو کام بھی تو بھیجے گا نا۔'' ماسٹر ابراہیم ہنسے تھے۔

PakiBooks.Site

"میں چلتا ہوں اب..... آج ویزا کے لیے اپلائی کرنا تھا۔ دُعا کریں ویزا لگ جائے۔" وہ لڑکا اپنا کام سمیٹ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ماسٹر ابراہیم نے اُسے دیکھے بغیر کہا۔

"اس سال نہیں لگے گا..... اس لیے پیسے ضائع نہ کرو..... اگلے سال جانا..... تب تک کوئی آجائے گا میرے پاس تمہاری جگہ۔"

لڑکا اُن کی بات پر گڑبڑا کر ہنسا۔ "چلیں آپ نے تو بات ہی ختم کردی۔ خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" ماسٹر ابراہیم نے اُسے جاتے ہوئے اور مومنہ کو آتے ہوئے دیکھا تو بے ساختہ بولے۔

"تم کہاں غائب ہو جاتی ہو مومنہ؟" مومنہ نے جواباً مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اُنہیں سلام کیا۔ انہوں نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"لاہور سے کب آئیں واپس؟"

وہ اب برآمدے میں بیٹھ رہی تھی۔

"بڑے دن ہو گئے۔" اُس نے کہا پھر اُٹھ کر شیلف سے اپنا قرآن اور کام نکال لائی۔

"سب ٹھیک رہا؟" ماسٹر ابراہیم کو وہ بہت کمزور لگی۔

"ہاں۔ مجھے فلم مل گئی۔" اُس نے دوبارہ فرش پر بیٹھتے ہوئے قرآن پاک کے وہ صفحے نکال لیے جن کی وہ درستی کے لیے خطاطی کر رہی تھی۔

"بہت مبارک ہو۔ بڑی خوشی کی خبر ہے یہ تو۔" مومنہ نے جھک کر خالی کاغذ پر ایک لکیر کھینچی جیسے قلم کی نوک چیک کر رہی ہو۔

"پتا نہیں۔" وہ ایک لحظہ کے لیے رُکی۔

"جہانگیر کیسا ہے؟" ماسٹر ابراہیم نے چند لمحوں بعد پوچھا۔

"وہ مر گیا۔" اُس نے سر جھکائے جھکائے اُن کا چہرہ دیکھے بغیر کہا۔

"تم نے بتایا ہی نہیں، میں اُس کا جنازہ پڑھنے آتا۔ مجھے بڑا افسوس ہوا ہے مومنہ بیٹی۔" ماسٹر ابراہیم کو واقعی صدمہ ہوا تھا۔ وہ اُسی طرح بے تاثر چہرے کے ساتھ سر جھکائے کام کر رہی تھی۔

"چپ کیوں ہو؟" انہوں نے اُس سے پوچھا۔ اُس کی خاموشی اُنہیں تکلیف دہ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سر جھکائے بہت دیر کچھ لکھتی رہی پھر اُس نے سر اُٹھایا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

شائع ہو گئے ہیں

☆ فصل غم کا گوشوارہ رضیہ جمیل قیمت: -/300 روپے
☆ زرد موسم راحت جبیں قیمت: -/1000 روپے
☆ حساب دل رہنے دو نبیلہ عزیز قیمت: -/400 روپے

خوبصورت سرورق
خوبصورت چھپائی
مضبوط جلد
آفسٹ پیپر

"آپ سے آزمائش ختم ہونے کی دعا کی تھی۔ جہانگیر کے ختم ہونے کی خواہش تو نہیں کی تھی۔" آواز بھرائی۔ آنسو اُس کے گالوں پر بہنے لگے۔ اُس نے رگڑنے کی کوشش کی یوں جیسے انہیں چھپانا چاہتی ہو

"رو لو..... روئی نہیں ہو نا۔" ماسٹر ابراہیم نے مرہم جیسے لہجے میں اُس سے کہا۔

"جہانگیر ختم ہو گیا..... آزمائش ختم نہیں ہوئی..... ہال ہال فرش میں جکڑا ہے میرا..... میں نے کیا رو

ماسٹر صاحب..... مرد درد میرے سارے آنسو پی گیا ہے۔"

اُس نے گہرا سانس لیا یوں جیسے رُکے ہوئے سانس کو بحال کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"میں صبح اُٹھتی ہوں تو لگتا ہے، مجھے اُس کو ہاسپٹل لے کر جانا ہے۔ پھر یاد آتا ہے، وہ تو ہے ہی نہیں۔ اور اماں کی کمر ٹوٹ گئی ہے، وہ ہر وقت روتے رہتے ہیں۔ اور میں..... میں ڈھیٹ ہو گئی ہوں..... کھانا کھا ہوں..... پانی پیتی ہوں..... سوتی ہوں۔ سارے کام کرتی ہوں بس روتی نہیں۔ میں کتنی ڈھیٹ ہوں۔" ا نے عجیب انداز میں ماسٹر ابراہیم کو دیکھا۔ اُس کے آنسو واقعی لمحوں میں خشک ہوئے تھے۔

"اللہ نے تمہیں صبر دیا ہے۔" ماسٹر ابراہیم نے کہا۔

"بہت زیادہ دے دیا ہے۔" مومنہ نے کہا۔ "مومنین پر آزمائشیں آتی ہیں۔ اجر بھی بڑا ہے۔"

"میں گناہ گار ہوں..... کہاں کی مومن..... کہاں کا اجر؟"

"مومنہ نام ہے تمہارا..... گناہ گار کیسے ہو سکتی ہو تم؟ اور اجر کا تو اللہ کا اپنے بندوں سے وعدہ ہے۔ اپنے وعدے کے خلاف نہیں جاتا۔ زبان کا بڑا پکا ہے میرا رب۔" انہوں نے اُسے دلاسا دینے کی کوشش کی تھی

"میں نے آج تک کبھی کوئی کام اجر کے لیے کیا ہی نہیں۔ نیکی بھی کی ہے تو اپنے آپ کو گناہ گار سمجھ کر ہے۔" وہ جیسے ماسٹر ابراہیم سے متفق نہیں ہوئی تھی۔

"اجر پھر بھی ملتا ہے مومنہ۔" ماسٹر ابراہیم نے اپنا جملہ دہرایا۔

"اجر کیا ہو گا اب میرے لیے ماسٹر صاحب..... جہانگیر کے بعد..... دُنیا کی کوئی شے نہیں جو میرا دل کر دے۔ میرے ماں باپ کا غم ختم کر دے..... کوئی اجر تھا بھی نا میرے لیے تو میرے گناہ کھا گئے اُسے۔" نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

"تم بہت اچھی روح والی لڑکی ہو مومنہ سلطان۔"

"اچھی روح؟" وہ نم آنکھوں کے ساتھ ہنسی۔ "آپ مجھے نہیں جانتے ماسٹر صاحب..... آپ شرمندہ کر رہے ہیں مجھے۔"

"ہم میں سے کوئی کسی کو نہیں جانتا مگر رب خوب جانتا ہے..... آؤ جہانگیر کے لیے دعا کریں۔" انہوں نے اپنے ہاتھ اُٹھائے تھے۔ مومنہ اُنہیں دیکھنے لگی۔

☆☆☆

ماسٹر ابراہیم کے گھر سے واپسی کے پورے راستے وہ اُن کے جملوں کے بارے میں سوچتی رہی۔

"اجر تو اللہ کا اپنے بندوں سے وعدہ ہے اور اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں جاتا۔ زبان کا بڑا پکا ہے میرا رب۔"

اُن کے جملے اُس کے کانوں میں گونجتے رہے اور سفر کرتے ہوئے اُس نے سوچا، وہ کون سی چیز تھی جو اُسے ملتی تو وہ اُسے اپنا اجر سمجھتی..... اُس کے ذہن کی اسکرین پر ایک ہی نام اور چہرہ آیا تھا اور اُس نے اُسے اپنے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ وہ ناممکنات پر یقین نہیں رکھتی تھی۔

اپنے گھر کے صحن میں داخل ہوتے ہوئے اُس نے اندر سے آتی ایک آواز سنی تھی اور اُسے ناممکنات پر یقین آ گیا تھا وہ جسے اپنا اجر سمجھتی، وہ اُس کے گھر پر موجود تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

PakiBooks.Site